

ادب اور سماجی نفسیات: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف اور دہشت کی عکاسی

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد عادل



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۳ء

ادب اور سماجی نفسیات: خیر پختہ نخواستہ کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف اور دہشت کی عکاسی

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد عادل

یہ مقالہ

ایم فل اردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ادب اور سماجی نفسیات: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف اور دہشت کی عکاسی

پیش کار: محمد عادل

رجسٹریشن نمبر: 36/MPhil/Urd/F21

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

تاریخ:

اقرارنامہ

میں، محمد عادل حلفاً بیان کرتا ہوں کہ زیرِ نظر مقالہ بعنوان ”ادب اور سماجی نفسیات: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف اور دہشت کی عکاسی“ کے سلسلے میں کی گئی تحقیق میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں نے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل کے سکالرشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ کسی دوسرے ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی آئندہ کہیں اور پیش کیا جائے گا۔

محمد عادل

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
III	مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم
IV	اقرارنامہ
V	فہرست ابواب
VIII	Abstract
IX	اظہار تشکر
I	باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف، بنیادی مباحث
I	الف۔ تمہید
I	۱۔ موضوع کا تعارف
۲	۲۔ بیان مسئلہ
۲	۳۔ مقاصد تحقیق
۲	۴۔ تحقیقی سوالات
۳	۵۔ نظری دائرہ کار
۳	۶۔ تحقیقی طریقہ کار
۳	۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق
۴	۸۔ تحدید
۴	۹۔ پس منظر کی مطالعہ
۵	۱۰۔ تحقیق کی اہمیت
۵	ب۔ سگمنڈ فرائیڈ: بنیادی تنقیدی تصورات

۸	۱۔ سیاست میں خوف اور فرائیڈ کے تنقیدی نظریات
۱۷	۲۔ خوف اور دہشت گردی کے سماجی اثرات
۱۷	۳۔ سماجی خوف کی علامات
۱۷	i۔ نفسیاتی علامات
۱۸	ii۔ جسمانی / ظاہری علامات
۱۸	iii۔ عمومی علامات
۱۸	ج۔ سماجی خوف کی وجوہات
۲۰	د۔ سماجی خوف کے نقصانات
۲۱	ھ۔ مجموعی جائزہ
۲۴	حوالہ جات
۲۵	باب دوم: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف کے عناصر
۲۶	الف۔ شناخت کا خوف
۲۷	ب۔ خوف کے ذرائع
۲۸	ج۔ خوف کا مقابلہ کرنا
۲۹	د۔ افسانہ نگاروں کے ہاں خوف
۳۵	ھ۔ موت کا خوف
۴۱	و۔ بے روزگاری کا خوف
۴۳	ز۔ تنہائی کا خوف
۴۶	ح۔ دہشت گردی کا خوف
۵۱	حوالہ جات
۵۲	باب سوم: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں دہشت گردی کے عناصر

۵۳	الف۔ مالیاتی اور حکمت عملی کی تفاوت
۵۳	i۔ نفسیاتی جہت
۵۳	ii۔ انٹر گروپ ڈائنامکس
۵۴	iii۔ میڈیا اور دھمکی کی تعمیر
۵۴	iv۔ عالمی سفارت کاری اور انسداد دہشت گردی کی کوششیں
۵۵	ب۔ بم دھماکے
۶۱	ج۔ خود کش حملے
۶۵	د۔ ڈرون حملے
۶۷	ھ۔ ٹارگٹ کلنگ
۷۰	و۔ جسمانی تشدد
۷۲	حوالہ جات
۷۳	باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات
۷۳	الف۔ مجموعی جائزہ
۷۷	ب۔ تحقیقی نتائج
۷۷	ج۔ سفارشات
۷۹	کتابیات

ABSTRACT

The title of my Research, Thesis for my M.Phil. Urdu is “Literature and Social Psychology: Depiction of Fear and Terror in the Contemporary selected Urdu Short Story of Khyber Pakhtunkhwa”

Study of history tells us that man has been fighting with fear since the beginning of time. Sometimes fear of darkness, sometimes fear of water, sometimes fear of gods and sometimes fear of self. Terrorism has scared people in the present age. This research paper examines the effects of fear caused by terrorism in Khyber Pakhtunkhwa. Three Urdu fiction writers from Khyber Pakhtunkhwa have been selected for this research, including Jameel Kachu Khel, Yusuf Aziz Zahid and Hamza Hasan Sheikh. These three fiction writers closely observed the changing social demography of this region and described the problems of this region in their fictions. Analytical study of these myths reveals that the people of this region are suffering from various socio-psychological problems due to terrorism. Due to terrorism, the people of this region are facing psychological problems like loneliness, depression, fear, terror, despair and fear. Apart from this, the socio-political conditions of this region also had a profound impact on the literature here. Terrorism and war created new themes in the literature of this region. Which include topics of murder, suicide bombing, target killing, kidnapping, violence and isolation. In this research paper, a review of the literature of this region is also presented.

The literature of this region has been examined in the context of various social and political conditions and trends in them have been noted. The major change in the literature of this region is the change in its themes. Apart from this, the social and economic problems of this region have also been reviewed in this research paper. Social problems include hate, theft, ignorance, drugs, violence and homelessness, while economic problems such as unemployment, homelessness, lack of food are imposed on this region. At the end of this research paper, there is a summary review, in which the researcher presents his findings by presenting all the arguments and evidence. In the light of which aspects of further research on the problems of this region have come out.

اظہار تشکر

شکر اس رب تعالیٰ کا، جس نے مجھے اس مقام تک پہنچایا اور مجھے اتنی ہمت، قوت عطا فرمائی جس کی وجہ سے میں نے اپنے کام کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان سب میں پہلے میں اپنے والدین کا جتنا شکریہ ادا کروں وہ کم ہے، انھوں نے خود مصائب جھیلے، تکالیف برداشت کیں لیکن مجھے اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایچ۔ نائن، اسلام آباد کے ہمدرد پرنسپل پروفیسر جاوید اقبال مغل صاحب کا ذکر اس لیے کروں گا کہ سر نے مقالہ لکھنے کے لیے کالج کے ہاسٹل میں پُرسکون ماحول فراہم نہ کیا ہوتا تو یہ کام بغیر اس کے ناممکن تھا۔ سر کی لمبی زندگی کے لیے میں ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔ پروفیسر ڈاکٹر قدرت اللہ خٹک نے مقالے کی شروع سے لے کر آخر تک میری رہنمائی کی اور مقالے کے اختتام تک مجھے مواد فراہم کرتے رہے، اُن کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید بہت سا کام ادھورا رہ جاتا۔ میں اپنے اسکول کے زمانے کے ٹیچر محترم انعام الحق صاحب کا بھی دلی شکر گزار ہوں جنھوں نے اسکول کے زمانے میں اردو زبان و ادب میں میری خاص دلچسپی بڑھادی تھی۔ چھوٹے بھائی محمد زید کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے ہمیشہ مدد فراہم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں دکھائی ہے۔ ہمیشہ سے ایک مخلص دوست کی طرح میرا ساتھ دیا ہے۔

سعودیہ عرب میں مقیم اپنے ماموں قابلِ قدر عزیز الدین اور عباس خان کے خلوص اور محبت کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُن کے خلوص اور محبت بھرے الفاظ نے مجھے اپنے کام سے مخلص رکھا ہے اور مایوسی سے دور کیا ہے۔ آخر میں بالخصوص اپنے نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر عنبرین تبسم شا کر جان کا انتہائی شکر گزار ہوں جنھوں نے انتہائی صبر سے کام لے کر حائل تمام مشکل رکاوٹیں بھی دور کیں اور مقالے کی تکمیل میں بھی مخلصانہ مدد کی۔

محمد عادل

سکالر ایم۔ فل اُردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION):

مجوزہ موضوع تحقیق "ادب اور سماجی نفسیات: خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف اور دہشت کی عکاسی" کے تحت دہشت گردی کا شکار علاقوں کے افسانوں میں خوف اور دہشت کے عناصر کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا یعنی افسانہ نگاروں نے دہشت گردی سے پیدا ہونے والے خوف اور دہشت کو کن حوالوں سے اور کس انداز میں اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ اس حوالے سے سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ انسانی نفسیات پر دہشت گردی کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کی نوعیت کیا ہے؟ اور افسانہ نگاروں نے کس طرح خوف اور دہشت کے اثرات کو قبول کیا؟ دہشت گردی کے پیدا کردہ خوف اور دہشت کے اثرات انفرادی و اجتماعی دونوں سطح پر مرتب ہوتے ہیں۔ سماج غیر یقینیت، بد امنی، بیگانگی اور بے چہرگی کا شکار ہوتا ہے۔ خوف و دہشت سے زندگی کا تعمیری سفر رک جاتا ہے۔ ہر طرف افراتفری کی صورتحال ہوتی ہے۔ فرد اپنے مستقبل کے بارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انفرادی سطح پر خوف اور دہشت فرد کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ فرد تنہائی، ذہنی کمزوری، افسردگی اور دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔

مجوزہ موضوع تحقیق کے پہلے مرحلے میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ دہشت گردی کے واقعات سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے مقامات سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پشاور سے یوسف عزیز زاہد، سوات سے محمد جمیل کاچوخیل اور ڈیرہ اسماعیل خان سے حمزہ حسن شیخ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانہ نگاروں کے ہاں دہشت گردی کے علاوہ متفرق سماجی مسائل پر مبنی موضوعات بھی پائے جاتے ہیں جن میں جدید و قدیم تہذیبی تصادم، ٹیکنالوجی کے مثبت و منفی اثرات، معاشرتی استحصالی رویے، مشینی زندگی، انتہا پسندی، پرانی اقدار کی پامالی، روایتی موضوعات اور قصوں کو نئے رنگ، ڈھنگ میں بیان کرنا شامل ہیں۔ تاہم مجوزہ موضوع مذکورہ افسانہ نگاروں کے ہاں دہشت گردی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف اور دہشت کی عکاسی پر مشتمل ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ (THEESIS STATEMENT):

دنیا بھر میں اور بالخصوص پاکستان میں دہشت گردی کی لہر سے پیدا ہونے والی تبدیلی کا اثر ادب پر بھی پڑا۔ خصوصاً شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اس سماجی تبدیلی کو فوراً اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات کم اور زیادہ تناسب کے ساتھ ملک بھر میں پیش آئے۔ تاہم صوبہ خیبر پختونخوا کو دہشت گردی نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہاں کے افسانہ نگاروں میں سے اکثر ان واقعات سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں لہذا ان کے افسانوں میں جہاں زندگی کے متفرق پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے وہیں دہشت گردی کا موضوع اور اس کے متعلقات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ مجوزہ موضوع تحقیق کے تحت دہشت گردی سے ان متاثرہ علاقوں میں سامنے آنے والے منتخب افسانوں میں دہشت گردی کے واقعات سے پیدا ہونے والے خوف و دہشت کے نفسیاتی اثرات کی کھوج لگائی جائے گی۔

iii۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES):

مجوزہ تحقیقی مقالہ کے تحقیقی مقاصد درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں دہشت گردی کا شکار علاقوں میں خوف اور دہشت کے ع ناصر کا جائزہ لینا۔
- ۲۔ خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کے نفسیاتی مسائل کی پیش کش کا احاطہ کرنا۔
- ۳۔ خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں میں خوف و دہشت کے سماجی اثرات اور نوعیت کا مطالعہ کرنا۔

iv۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS):

- ۱۔ دہشت گردی سے متاثرہ خطوں کے افسانے میں خوف و دہشت کے عناصر کی نوعیت کیا ہے؟
- ۲۔ خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر اردو افسانے میں خوف و دہشت کی عکاسی صراحتی نوعیت کی ہے یا علامتی؟
- ۳۔ مذکورہ افسانوں میں دہشت گردی سے متاثرہ معاشرے میں اجتماعی و انفرادی سطح پر خوف و دہشت کے کن اثرات کی عکاسی کی گئی ہے؟

v- نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK):

افسانہ مختصر کہانی پر مبنی ہوتا ہے اور اس کو ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کا اپنے دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی حالات و واقعات سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ادیب بھی کسی نہ کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے اور معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اور حادثات سے ادیب معاشرے کا حساس فرد ہونے کے ناتے گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ نتیجتاً اس اثر کو شعوری و لاشعوری ہر دو اطوار سے اپنی تخلیقات میں شامل کرتا ہے۔ دہشت گردی کے واقعات میں اضافے سے خوف، دہشت، ذہنی اور نفسیاتی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ ان تینوں عناصر یعنی خوف، دہشت اور نفسیاتی مسائل کے خصوصی تناظر میں دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کے افسانوں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے گا۔ تحقیقی رہنمائی کے باب میں خوف و دہشت کی نفسیاتی تطبیق و تشریح کی غرض سے سکمنڈ فرائڈ کی کتب "Inhibitions, Symptoms and Anxiety" اور "A General Introduction to Psychoanalysis" میں شامل مضامین کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

vi- تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY):

مجوزہ موضوع دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کے منتخب افسانوں پہ مبنی ہے، لہذا موضوع سے متعلقہ مواد کی جمع آوری، ترتیب، مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے گا۔ تحقیق کے دوران موادی تجزیہ (Content Analysis) کے طریق کار کو استعمال میں لایا جائے گا۔

مجوزہ موضوع تحقیق کے تحت دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کے منتخب افسانوں میں خوف اور دہشت کے عناصر اور نفسیاتی مطالعہ شامل ہے اس لیے اس سے متعلقہ منتخب افسانے تحقیق کے بنیادی مآخذ ہوں گے۔ ثانوی مآخذات میں متعلقہ اردو افسانے پر چھپنے والی تحقیقی اور تنقیدی کتب کے علاوہ مختلف رسائل اور جرائد میں چھپنے والے مضامین بھی شامل ہوں گے، جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ تحقیق کے جدید ذرائع یعنی ویب گاہوں اور دیگر مآخذات سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جائے گا۔

vii- مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE):

معاصر اردو افسانے کی مختلف جہتوں پر کئی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ تاہم مجوزہ موضوع تحقیق پر اب تک جامعات میں تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ خیبر پختونخوا میں افسانہ نگاری کے حوالے سے سندی مقالہ جات کی فہرست درج ذیل ہے۔

- ۱۔ امیر تراب، خیبر پختونخوا کے اردو افسانے میں مولوی اور جاگیر دار کے کرداروں کی عکاسی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مملو کہ جامعہ پشاور، ۲۰۱۷ء
- ۲۔ سید زبیر شاہ، اردو افسانے پر نائن الیون کے اثرات، مقالہ برائے ایم فل، مملو کہ قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۱۲ء
- ۳۔ محمد عمران مائل، اکیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ اور اردو افسانہ، مقالہ برائے ایم فل، مملو کہ قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۱۷ء

viii۔ تحدید (DELIMITATION):

مجوزہ موضوع کے تحت دہشت گردی کی پیدا کردہ صورتحال کے تناظر میں متاثرہ علاقوں میں تخلیق کردہ اردو افسانے میں خوف اور دہشت کے عناصر کو مد نظر رکھا جائے گا۔ مجوزہ موضوع میں شامل خوف اور دہشت کے عناصر اور فرد اور سماج کی نفسیات پر اس کے اثرات کی عکاسی کو موضوع بنایا جائے گا۔ مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ دیگر جہات موضوع تحقیق کا حصہ نہیں ہوں گی۔ اکیسویں صدی کی پہلی دودہائیوں میں پاکستان کے اندر دہشت گردی کے ان گنت واقعات پیش آئے، جس کا نشانہ تقریباً سارا ملک بنا۔ تاہم خصوصیت کے ساتھ صوبہ خیبر پختونخوا میں جانی و مالی نقصانات کا تناسب زیادہ رہا۔ مجوزہ موضوع کے تحت منتخب کردہ افسانہ نگاروں کا تعلق صوبہ خیبر پختونخوا کے ان مقامات سے ہے جو دہشت گردی کی وجہ سے زیادہ متاثر ہوئے۔ منتخب افسانہ نگاروں اور متعلقہ علاقوں کے اسماء درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ یوسف عزیز زاہد از پشاور
- ۲۔ محمد جمیل کاچوخیل از سوات
- ۳۔ حمزہ حسن شیخ از ڈیرہ اسماعیل خان

ix۔ پس منظر (LITERATURE REVIEW):

مجوزہ موضوع کے انتخاب سے پہلے جن کتب کو پیش نظر رکھا گیا ان میں ڈاکٹر ثروت اختر کی تصنیف "اردو ادب میں دہشت گردی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ "9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ" از ڈاکٹر نجیبہ عارف، "جدید اردو افسانے کے رجحانات" از ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، "خیبر پختونخوا میں اردو ادب" از پروفیسر گوہر نوید اور "جدید افسانہ" از ڈاکٹر شفیق انجم شامل ہیں۔ اس باب میں قرطبہ یونیورسٹی، پشاور سے ایم فل کی سطح پہ ہونے والا تحقیقی کام بہ عنوان "اردو افسانے پر نائن الیون کے اثرات" کو بھی دیکھا گیا ہے۔ مزید یہ کہ جامعہ پشاور کے شعبہ اردو کے مجلہ خیابان کے مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY):

اردو ادب میں دہشت گردی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ معاصر اردو افسانے پر دہشت گردی کے واقعات کے دو اہم نفسیاتی اثرات یعنی خوف اور دہشت کا مطالعہ مجوزہ تحقیق کا موضوع ہے۔ اگرچہ ادبی اصناف میں مختلف حوالوں سے نفسیاتی اثرات کی عکاسی یا پیش کش کے تحقیقی مطالعات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کے معاصر اردو افسانے میں موجودہ دور کے ایک اہم تر عالم گیر سماجی مسئلے یعنی دہشت گردی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف اور دہشت کے اثرات کی عکاسی پر مشتمل تحقیقی کام نیا اضافہ ہوگا۔ مذکورہ افسانے کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بڑھتی ہے کہ ان کو تحریر کرنے والے براہ راست دہشت گردی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف اور دہشت کے زیر اثر رہے ہیں اور ان احساسات کو اسی طرح اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

ب۔ سگمنڈ فرائیڈ: بنیادی تنقیدی تصورات:

فرائیڈ شخصیت کی تین قوتیں متحرک حصوں میں دیکھتا ہے ایڈ (Id)، انا (Ego) اور فوق الانا (Super Ego)۔ یہ تینوں قوتیں مسلسل متضاد رہتی ہیں۔ اور کردار پر دباؤ ڈال کر اس کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ اپنے ماحول سے موافقت یا عدم موافقت پیدا کرنے والا کردار انہی قوتوں کی کار فرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تینوں قوتیں لاشعور میں باہم نبرد آزما ہوتی ہیں۔ ان کے باہمی ٹکراؤ سے جو کشمکش (Conflict) پیدا ہوتی ہے۔ اس کا حل بھی عموماً لاشعور میں ہی پایا جاتا ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ کردار کی تعمیر میں طفولیت کے ماحول، حالات اور برتاؤ کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

ایڈ، انا اور فوق الانا یہ تینوں قوتیں فرد سے باہم متضاد مطالبات کرتی ہیں۔ اس میں بنیادی تال میل کا فقدان ہوتا ہے۔ ایڈ فرد کی بنیادی قوت ہوتی ہے۔ یہ بچے کے اندر ارتقاء کی پہلی سیڑھی پر ہی موجود ہوتی ہے۔ ایڈ بنیادی طور پر خواہشات کو پورا کر کے راحت حاصل کرنا اور ہر طرح کی اذیت سے دور رہنا چاہتی ہے اور فوری طور پر خواہشات کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت کا تقاضا کیا ہے اور اخلاقی تقاضے کیا ہیں اس سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے ایڈ (Id) کی اضطرابی تحریک (Impulses) خواہشات کی تکمیل کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ محل و موقع اور گرد و پیش کے حالات و کوائف کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ انجام سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ ایڈ حیوانی خواہشات کا ذخیرہ ہے۔ اس میں تشدد کی ایسی شدید خواہش بھی ہو سکتی ہے جو فرد کے قابو سے باہر ہو۔ ایڈ کی اضطرابی تحریک

ذہنی اختلال پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ تشدد، دوسروں پر حملے، ناپسندیدہ واضطراری حرکتیں ان کی علامتوں میں شامل ہیں۔ اگر اس کو لگام نہ دی جائے تو انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانی خواہشات کو آزاد کر دے گا۔ اور دنیا میں انتشار اور لا قانونیت پھیلانے کا سبب بنے گا۔ دوسری قوت انا (Ego) ہے۔ جو آگہی کے حصول کے ساتھ شخصیت کا خاصہ بنتی ہے۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے والی یہ سب سے اہم قوت ہے۔ یہ حقیقت پسند ہوتی ہے۔ اس کی رہنمائی دنیاوی حقائق کرتے ہیں۔ یہ ایڈ کے لیے لگام کا کام کرتی ہے۔ لیکن Ego کردار کو قابو میں تو رکھتی ہے مگر انسانی کردار کے اخلاقی پہلو سے اس کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے شخصیت میں ایک تیسری قوت سرابھارتی ہے۔ جس کو فوق الانا یا Super Ego کہتے ہیں۔ یہ معاشرے، خاندان، والدین اور مذہب سے ملنے والے اخلاقی ضابطوں سے پیدا ہوتی ہے۔ شخصیت کا یہ حصہ Ego کا ہی ایک حصہ ہے۔ جو اس سے الگ ہو کر مثالی انا (Ideal Ego) کے طور پر ابھرتا ہے۔ اس کی ایک اخلاقی قوت کی حیثیت ہے۔ یہ شخصیت کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور فرد کے کردار کو اخلاقی قدروں اور صحت مند مقاصد کے حصول کی طرف گامزن کرتی ہے۔ اس کی نوعیت تعمیری ہوتی ہے۔ اور یہ صحت مند سماجی و تہذیبی نشوونما کا سبب بنتی ہے۔

اس طرح ایڈ اور Super Ego متضاد قوتیں ہیں، جو دو انتہا پر ہوتی ہیں۔ انا ان دونوں کے درمیان رہ کر تطبیق (Adjustment) کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا واسطہ ہے جو دو مخالف قوتوں کے درمیان مفاہمت کراتا ہے۔ Super Ego اور Id دو انتہائی قوتیں ہیں۔ ایک بے لگام ہے تو دوسری ضابطوں اور اخلاق کی اس قدر پابند کے ماحول کے مطالبات کے مطابق اپنے اندر لچک نہیں لاسکتی۔ یعنی ایک تشدد ہے تو دوسری اس قدر سنجیدہ کے انسان کو بے عمل بنا دے۔ سگمنڈ فرائڈ Sigmund Freud (۱۸۵۶-۱۹۳۹) آسٹریا کا یہودی النسل باشندہ فیربرگ میں پیدا ہوا۔ نازیوں نے جب ۱۹۳۷ء میں آسٹریا کا الحاق کر لیا تو اس نے انگلستان میں پناہ لی۔ ۱۸۸۱ء میں ویانا یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی اور وہیں طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۶ء تک پیرس میں رہ کر اس نے شارکت (Chroct) کے طریق علاج کا مطالعہ کیا۔ ویانا واپس آ کر اس نے ڈاکٹر جوزف بریور (Joseph Breuer) سے ایک اور طریق علاج سیکھا۔

۱۸۹۰ء میں فرائڈ نے تحلیل ذات (Self analysis) کے طریقے پر اپنے ہی لاشعور کی طاقتوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا اور اپنے خوابوں کی تحلیل و تعبیر بھی۔ اسی زمانے میں اس نے اپنے زیر علاج مریضوں کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر انسانی شخصیت کے بارے میں ایک جدید نظریے کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۰۰ء میں اس کی کتاب تعبیر خواب (Interpretation of dreams) شائع ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں اس کی کتاب "روزمرہ زندگی کی

نفسیات " (The Psychology of Every day Life) شائع ہوئی۔ جس میں اس نے بتایا کہ معمولی خطائیں، فروگزاشتیں، حادثات، ناقص حافظہ، لغزش زبان وغیرہ سب لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہیں۔ فرائڈ جدید علم نفسیات کا بانی اور تحلیل نفسی کا موجد ہے۔ علم نفسیات پر اس کے افکار و نظریات کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ حد یہ ہے کہ فرائڈ کے اثرات نفسیات، تربیت و تعلیم سے گزر کر ادب و فن، طب و تجارت! غرض زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گئے ہیں۔ مگر اس کے سب سے زیادہ گہرے اور شدید اثرات یورپ و امریکہ کی موجودہ اجتماعی زندگی پر مرتسم ہوئے اور وہیں سے ایک متعدی بیماری کی طرح مشرق میں بھی پھیل گئے۔

اس کے نظریہ لاشعور (Unconscious) اور انسانی اعمال کی جنسی تعبیر (Sexual Interpretation) نے دور جدید کی اجتماعی زندگی میں ایک تہلکہ مچا کر رکھ دیا ہے۔ ہر چند کہ نفسیات میں نئے نئے نظریات بھی فروغ پا رہے ہیں، مگر مغرب کی بیشتر فکری پیش رفتوں میں اصل متحرک فرائڈ کے افکار ہیں اور ہر ذہنی اُتچ کے پروان چڑھنے کے لیے توانائی اسی کے نظریات سے ملتی ہے۔ بلاشبہ فرائڈ عبقریت (Genius) کی حامل ایک عظیم شخصیت ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کے تمام افکار و خیالات درست سمجھ لیے جائیں اور یقین کر لیا جائے کہ اس نے نفس انسانی کی تعبیر میں کوئی بنیادی غلطی نہیں کی ہے۔ فرائڈ کے افکار و نظریات پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں، خاص طور پر انسانی زندگی کو جنس کی آلودگیوں میں لتھیرنے پر تو بہت واویلا مچا ہے۔ یہ نقاد کہتے ہیں کہ فرائڈ نے غیر مستقیم (Abnormal) لوگوں کا جائزہ لے کر ان سے عام احکامات مستنبط کر لیے اور انہیں مستقیم (Normal) لوگوں پر بھی چسپاں کر دیا۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ فرائڈ کا خود انسان کے بارے میں نقطہء نظر غلط ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسان ایک خالص مادی وجود ہے اور وہ جب تک خلاف معمول (Abnormal) حالات سے دوچار نہ ہو اس کے میلانات و جذبات کس طرح ارضی کشش سے نہیں نکل سکتے۔ فرائیڈ کی تحلیل نفسی psychoanalysis کا محور انسانی دماغ کا وہ بڑا گہرہ ہے جسے فرائیڈ اپنی نگارشات میں لاشعور کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ لاشعور دراصل ہمارے فطری اقتضات کی آماجگاہ ہے جو جنسی فعالیت کی شکل میں اپنی تسکین کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ فرائیڈ کے خیال میں انسانی رویوں کا بگاڑ دراصل کچھ دماغی عوارض کا نتیجہ ہے جو کہ خود انسان کی فطرت میں موجزن جنسی فعالیت اور بیرونی معاشرتی حقائق میں تناؤ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تناؤ اضطراب anxiety کی مختلف شکلوں کو جنم دیتا ہے۔ جن میں ذہنی یا دماغی اضطراب neurotic anxiety کی بڑی وجہ معاشرتی حدود و قیود میں انسان کی جنسی فعالیت کی عدم تسکین ہے۔ اضطراب کی یہ کیفیت اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان کو سزا کا خوف محض اس

لیے لاحق ہوتا ہے جب وہ اپنی جنسی جبلت کے تابع کسی ایسے اقدام کا ارتکاب کرتا ہے جو عمومی معاشرتی اقدار سے متصادم ہو۔ اضطراب کی دوسری شکل کا تعلق انسان کے اخلاقی امور moral anxiety سے ہے۔ ذہنی خلفشار کی یہ حالت انسان کے طبعی جنسی افعال اور خارجی دنیا کے اخلاقی مطالبات کے مابین عدم اتفاق کا نتیجہ ہے۔

جنسی تسکین کی بے لگام خواہش انسان میں مدافعتی رجحانات کو جنم دیتی ہے جسے فرائیڈ ego defence کا نام دیتا ہے۔ مدافعتی رجحان انسان میں کئی طرح کے نفسیاتی جہانات کو پروان چڑھاتا ہے جن کا مقصد واضح حقائق کو جھٹلانا اور اس طرح کسی طور اپنے آپ کو اضطراب سے نجات دلانا ہوتا ہے خواہ یہ کوشش بظاہر انتہائی بھونڈی اور ناقابل یقین ہی کیوں نہ ہو۔ مدافعتی رجحان کی ایک صورت repression کہلاتی ہے۔ اس رجحان کے تحت انسان اپنے ماضی کی کسی تلخ یاد کو زبردستی مٹا ڈالنے کی لاشعوری کوشش کرنے لگتا ہے۔ ایک اور رجحان projection کہلاتا ہے جس کے تحت انسان اپنے قابل اعتراض میلانات کی توجیح دوسرے لوگوں کے کردار کے ذریعے کرتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اپنے غیر عقلی و غیر منطقی میلانات کو منطقی بنانے کی شعوری کوشش rationalization کہلاتی ہے۔ ایک رجحان کو فرائیڈ denial کا نام دیتا ہے جس کے تحت انسان کسی آنکھوں دیکھی واضح حقیقت کے وجود تک سے انکار کر دیتا ہے۔ فرائیڈ کے بیان کردہ مدافعتی رجحانات عام انسانوں کی روزمرہ زندگی میں بڑی حد تک درست انداز میں منطبق ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاست میں خوف اور فرائیڈ کے تنقیدی نظریات:

ایک ساختی بین الاقوامی تعلقات (IR) نظریہ کے طور پر نیوریلزم کے موقف یا خود کی تصویر کو دیکھتے ہوئے جس کے تحت انارکی، نہ کہ لوگوں یا حکومت کی اقسام عالمی سیاست میں ریاستی رویے کی وضاحت کرتی ہے (2001 Mearsheimer) یہ قابل ذکر ہے کہ سیاسی لبرل ازم پر اس کے تازہ ترین بڑے پیمانے پر حملے میں خارجہ امور میں 14 جون 2018 John Mearsheimer انسانی فطرت اور سیاست کے بارے میں اپنی سوچ پیش کرتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ تجربے کی تینوں سطحوں پر خوف کو تلاش کرتا ہے انفرادی زندگی سماجی گروپوں اور بین الاقوامی نظام میں ایک طاقتور عنصر کے طور پر۔ اس باب میں میرا مقصد یہ ہے کہ فرائیڈ کی نفسیاتی تجزیہ کو ایک طریقہ کار کے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، خوف کی ان تصاویر میں سے ہر ایک کو جیسا کہ میر شیمیر انہیں پیش کرتا ہے، کی وضاحت اور چیلنج کرنا ہے، اور ایک ساختی قسم کے باہمی خوف کی ایک متبادل پوزیشن کا خاکہ پیش کرنا ہے جو اس سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ انسانی ایجنٹوں کے ذہن اگرچہ فرائیڈ پیدین کے خوف کے تصور کو کسی نہ کسی طرح کی ریاستوں کے طور پر ایک شخص کی تشبیہ تک کم

کیے بغیر۔ یہاں، میر شیمر کے خوف کی انسانی فطرت کے تصور کے خلاف میری دلیل یہ ہے: یہ بہت سطحی ہے اور ظاہر ہے کہ جمود کے حق میں نظریاتی طور پر متعصب ہے۔

ورڈزور تھ خوف کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

”خوف اور اس کی نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ کسی خطرے کو اپنے سامنے دیکھتے ہوئے انسان پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے۔ جس کی کئی شکلیں ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ خوف بھی ایک جبلت ہے۔ ایک پیدائشی حس ہے جو انسان میں خوف کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جس کے ساتھ ہی گریز کی خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن جب یہ صورت حال ختم ہوتی ہے، خوف خود بہ خود دور ہو جاتا ہے۔ حقیقی خطرے کی صورت حال میں خوف زدہ ہونا ایک قدرتی بات ہے۔“^(۱)

پھر بھی اس سے پہلے کہ ہم فرائیڈ کے تنقیدی تجزیہ پر پہنچیں کہ میر شیمر کیا سوچتا ہے۔ تم اور مجھے اور وہ کیوں سوچتا ہے کہ ہم بہت خوفزدہ ہیں انہیں مجھے اس رائے کا آغاز دو تریدوں سے کرنا چاہیے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر دبایا گیا تو میں خود کو فرائیڈ کے کیمپ میں رکھ دوں گا۔ یعنی جب کہ فرائیڈ کی جنگیں جاری ہیں، جلد ہی ختم ہونے کا امکان نہیں ہے کیونکہ وہ انسانی ذہن کے سب سے اہم لیکن متنازعہ، نظریہ سازوں میں سے ایک ثابت ہوتا ہے، شکی لوگ اس حقیقت کو پڑھنا چاہیں گے کہ حالیہ مطالعات انیکٹیو نیوروسائنسز اور نیوروبائیولوجی نے بہت سی چیزوں کی حمایت کی ہے جس کے لیے فرائیڈ کو اب دنیا کے مشہور وینیز برگ گاس ۱۹ اپارٹمنٹ میں اپنا صوفہ استعمال کرنا پڑا۔ جہاں تک دوسرے طریقہ کار سے متعلق دستبرداری کا تعلق ہے، مجھے یہاں یہ بھی بتانا چاہیے کہ مثبت اور معیاری بین الاقوامی تھیوری اور سیاسی طریقہ کار کے لحاظ سے میرا کام کلاسیکی نقطہ نظر ۱۹۶۶ء Bul کو اپناتا ہے، اور ہنس کیلسن کے نظریہ قانون سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ بین الاقوامی قانونی حکم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط چاہیے سے کبھی اخذ نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن libidinal impulses کے بارے میں بہادر ہونے کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ بے شک اچھا ہو یا برا سوچنے اور دوبارہ سوچنے کے ہمارے ہنر کو تیز کرتا ہے، انفرادی اور سیاسی زندگی میں واقعی کیا ممکن ہے (2021 Schuett) یا جیسا کہ کین بوتھ (2007:241) نے کہا، فرائیڈ نے ہمیں دکھایا کہ اس طرح کی نظر ثانی کتنی بنیاد پرست ہو سکتی ہے۔

اب Mearsheimer کے خوف کے تصور کی پہلی تصویر کی طرف رجوع کرنے کے لیے neorealist منطق کے ناقدین آخر کار اس سے براہ راست سننے پر خوش ہوں گے، جس کا طویل عرصے سے شبہ

تھا۔ کسی بھی دوسری قسم کے سیاسی اور بین الاقوامی نظریہ کی طرح، نیوری یلزم کے جارحانہ انداز میں بھی اچیلز بیل ہے، جس میں یہ انسانی فطرت کے بارے میں مفروضوں پر مبنی ہے، جو نظریہ کے ایک نامعلوم حصے میں رکھے جاتے ہیں اور اس طرح ان کا پردہ فاش ہونا ضروری ہے، خاص طور پر کیونکہ یہ نظریاتی تنقید کرنے کا ایک طریقہ ہے (2010 Schuett) حقیقت یہ ہے کہ میں عظیم فریب لبرل خواب اور بین الاقوامی حقائق وہ صفات جو تمام لوگوں میں مشترک ہیں کے حوالے سے اپنی سیاسی سوچ اور لبرل ازم پر تنقید، تاہم اس کے معاملے میں مدد نہیں کرتی۔ درحقیقت یہ اسے کم کر دیتا ہے، اور میں حیران ہوں کہ وہ ممکنہ طور پر اس بات کی وضاحت کیسے کر سکتا ہے کہ وہ بین الاقوامی انارکی کی ساختی ترتیب میں اقتدار کے لیے قدامت پسند قوم پرستی کی جدوجہد کو انسانی فطرت کے کسی حد تک سادہ اور مثالی تصور سے کیسے حاصل کرتا ہے۔

جیمز لیننگ اپنے نظریہ ہیجان میں خوف کی تعریف یوں کرتے ہیں:

”جسم جو کچھ محسوس کرتا ہے اس سے پیدا ہونے والے جسمانی اثرات کا نام ہیجان ہے۔ شعوری ہیجان درحقیقت صرف ان جسمانی تغیرات کے احساس کا نام ہے جو ہیجانی کیفیت پیدا ہونے سے رونما ہوتے ہیں۔ ہم اس لیے نہیں کانپتے کہ خوفزدہ ہیں بلکہ خوف زدہ ہوتے ہیں اس لیے کانپتے ہیں۔“^(۲)

اگر یہ واقعی سچ تھا کہ خوف محض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی قسم کے عقلی پیش کار سسٹم کا کام ہے جس کے تحت ہم سب فطرت کی حالت سے بچنا چاہتے ہیں، تو یہ فوری طور پر واضح نہیں ہو گا کہ وہ اتنا یقینی کیوں ہو سکتا ہے۔ کہ قومی ریاستیں خود ارادیت کے ساتھ اس قدر جنونی ہیں اور کیوں، اس لیے جلد کسی بھی وقت عالمی ریاست نہیں بننے والی ہے (2018:150 Mearsheimer)۔ اس کے لیے جو وہ واقعی کہہ رہا ہے ایسا لگتا ہے اگرچہ ہم سب کافی معقول ہوتے ہیں، لیکن ہم سب اپنی بقا کے لیے خوفزدہ ہیں کیونکہ ہم اس بات کا یقین نہیں کر سکتے کہ آیا، ہمارے ساتھ رہنے کے بنیادی اصولوں اور اقدار کی جدوجہد میں، چیزیں۔ شیطانی طور پر تشدد دیا جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ فرای بدین نقطہ نظر سے، یہ غلط نہیں ہے؛ لیکن خوف کا مسئلہ ایک اعلیٰ جذباتی اور محرک قوت کے طور پر تم اور مجھے ایک پریشانی کا باعث بننا ہے۔ ہمیں بمقابلہ نہیں بین الاقوامی زندگی میں دھانچہ۔ اس سے کہیں زیادہ برا یا بدتر ہے جتنا کہ میر شیمر کو لگتا ہے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے خوف کی انسانی فطرت کے بارے میں میٹ پر شیمر کا موقف حیرت انگیز طور پر مثالی لگتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فرائیڈ (1916-17، 1923، 1926، 1933) سے جو کچھ سیکھا ہے

وہ نہ صرف یہ ہے کہ خوف دماغی آلات میں ہمیشہ موجود رہتا ہے، لیکن یہ بھی کہ یہ ہم میں سے ہر ایک میں گہرائی میں واقع ہے۔ یہ بہت فطری ہے، اور ہمارے خوف سے فرار ہونے کا بہت کم امکان ہے حالانکہ ہم بھی نہیں پھنسے ہیں، جن میں سے اور بعد میں کہ کوئی سچائی سے کہہ سکتا ہے ہم بہت خوفزدہ ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں اور اپنی بقا کی فکر کرتے ہیں ایک چیز ہے۔ یہ بحث کرنا بالکل دوسری بات ہے کہ خوف پر زیادہ حقیقت پسندانہ اقدام ہمیں یہ تسلیم کرائے گا کہ ہمارے خوف بیرونی خطرات سے جڑے ہوئے ہیں، اور یہ اندر سے پیدا ہوتے ہیں۔ خوف کی سابقہ قسم جسے نام نہاد حقیقت پسندانہ اضطراب کہا جاتا ہے، خود کو محفوظ رکھنے کی جبلت کا مظہر ہے، اور ہمارے آس پاس کی دنیا میں خطرات کا سامنا کرتے وقت ہمیں ایک عام لیکن ناخوشگوار احساس دلاتا ہے۔ تاہم آخری قسم کا خوف، لاشعور میں گہرائی میں چھپا ہوا ہے: ہمارے اپنے لغوی جذبوں کا خوف ہے، ایک عصبی اضطراب جب انابر قرار رکھنے کے لیے اس سے لڑنا پڑتا ہے۔ آئی دی خلیج میں اور پھر معاشرتی جبر کا اتنا ہی دیرپا خوف ایک اخلاقی اضطراب، جب انا کے ساتھ متضادم ہے سیرانا بم اندرونی ثقافتی اصولوں، مزید اور قواعد کے لحاظ سے کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ Mearsheimer اپنے اصرار میں درست ہے کہ سلامتی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے، لیکن وہ اس بات کو غلط سمجھتا ہے جب وہ اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتا ہے کہ اپنی بقا کا خوف ہی ایک نفسیاتی بنیاد ہے جس سے سماجی اور سیاسی ہر چیز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خوف فرائیڈ (۱۹۳۰ء) کے مطابق خطرے کی نشاندہی کرتا ہے: ہم جسمانی زوال بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم فطرت کی تباہ کن قوتوں سے ڈرتے ہیں۔ اور یقیناً ہم ڈرتے ہیں ہمیں یعنی ہم میں سے ہر ایک کے جارحانہ پہلو (تشدد) سے ڈرتے ہیں، اور ہمیں تمام قاعدے اور اختیار میں موجود حقیقی دشمنی سے در لگتا ہے جس کی مرضی مگر شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے جس کی مرضی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ کسی بھی قسم کی ساختی IR نظریہ سازی کے خدشات سے بالاتر دکھائی دے سکتا ہے، پھر بھی میں یہ بحث کروں گا کہ خوف کی انسانی فطرت کے بارے میں اس قسم کے مفروضے مستقبل کی کوششوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، یا بہت اچھی طرح سے ہو سکتے ہیں۔ بنیادی نظریاتی مسئلہ یہ کہ اس قسم کی سیاسی حقیقت پسندی میں مائیکرو فاؤنڈیشن کا فقدان ہے، انسانی فطرت اور خوف کا ایک مستند نظریہ جو نیوریلسٹوں کو سیاسی اکائیاں پیدا کرنے کی اجازت دے گا۔ اور میں شامل کروں گا، سیاسی ڈھانچے جیسے بین الاقوامی انارکی کے ذہنوں سے۔ انسانی ایجنٹ (نشر ۱۹۹۶ء دیکھیں)۔ در حقیقت ایسا لگتا ہے کہ میئر شیمیر (۲۰۱۸ء ۴۴-۱۴) ایسا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ مناسب عنوان والی باب انسانی فطرت اور سیاست میں وہ حقیقت بن جاتا ہے بالکل بجا طور پر کم از کم میرے نزدیک ویسے بھی تمام سیاسی اور آئی آر تھیوری کے

لیے مائیکرو فاؤنڈیشنز کی اہمیت یہ سب تو دور کی بات ہے۔ عظیم طاقت کی سیاست کا المیہ (۲۰۰۱ء) اس بات کا یقین کرنے کے لیے جہاں انسانی فطرت کو ماضی کے رویے سے دور دور کے آثار کے طور پر دیکھا جاتا ہے، اور ہم انسانی فطرت کو واپس لانے کے لیے اس کی تعریف کر سکتے ہیں، جو کہ اہم ہے: کسی کی سیاسی سوچ کے تمام فلسفیانہ مفروضوں کو سامنے رکھنا۔ وہاں ہر کسی کو دیکھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے۔

پھر بھی Mearsheimer جیسا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ بہت سطحی رہتا ہے، جس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ انسانی فطرت اور خوف کے بارے میں اس کی گفتگو معلوماتی ہے اور ہمیشہ کی طرح دلچسپی رکھنے والے قاری کے لیے قابل رسائی ہے، لیکن یہ حقیقت میں یہ بتانے میں کم ہے کہ انسانی فطرت کا واقعی کس طرح سے تعلق ہے۔ لبرل ازم قوم پرستی اور ساختی حقیقت پسندی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوف کی تین تصویریں کس طرح ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ ہمیں جو کچھ دیتا ہے وہ ریاست کے طور پر شخصی تشبیہ کی ایک قسم کی غیر مصدقہ داستان ہے جس کے تحت خوف دراصل انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ایک ضمنی پیداوار ہے نہ کہ مرکز جیسا کہ Mearsheimer کہتا ہے تشدد کا یہ چھپا ہوا امکان جو افراد کو ایک دوسرے سے درنے اور اپنی بقا کے بارے میں فکر کرنے کا باعث بنتا ہے، اس کا اطلاق معاشروں کے ساتھ ساتھ افراد کے درمیان تعلقات پر ہوتا ہے۔ جب کہ وہ یہ بنانے میں حق بجانب ہیں کہ انسان گہرے سماجی مخلوق ہیں ہم یہ سوچ کر رہ جاتے ہیں کہ مختلف سیاسی برادریوں کے درمیان خوف کیوں ضروری طور پر ایک حد تک باہمی خوف کا باعث بنتا ہے کہ بین الاقوامی انارکی تقریباً فطری ترتیب کا اصول بن جاتی ہے۔ عالمی سیاست میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ خوف کے جذباتی اور محرک عنصر میں اگر ہم فرائیڈ کی پیروی کرتے ہیں تو ہمیں ایک وضاحت مل جاتی ہے کہ یہ کیوں درست معنی رکھتا ہے۔ تم اور مجھے اکیلے جانے کے لیے نہیں، بلکہ سیاست میں داخل ہونے کے لیے کمیونٹی، یہاں تک کہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کو پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ فرائیڈ ایک روسو کے عظیم وحشی کے خیال کو نہیں خریدتا، جو فطرت کی بے ترتیب حالت میں زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ کہ ہم اپنے وجودی خوف کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت پسندانہ اعصابی اور اخلاقی بہت قیمت پر آتا ہے تاہم گروہ بندی انسانی حالت کا سب سے مرکزی حصہ یا حقیقت بن جاتی ہے۔ اور فرائیڈ کی دماغی آلات کے تجربے تم میں، گروہ ایک ہی وقت میں سلامتی کے لیے حقیقی اور اخلاقی حوالہ جات ہوتے ہیں، جن کا تجارت قطری ترک کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہمیں خوف ہے اور ہم خوف پیدا کرتے ہیں۔ یہ تھو سید ای دز کے دن سے بہت کچھ واضح ہو چکا ہے، جب خوف زدہ سیار کنوں کو صدمے سے دوچار امتیاز سے لڑنا پڑا۔

خوف کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یعقوب لکھتے ہیں:

”خطرے کی صورت میں خوف زدہ ہونا ایک فطری عمل ہے۔ خطرے سے ہر شخص خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ خوف کی کیفیت ہمارے اندر ایک شعوری عمل کا نتیجہ ہے۔۔۔ خوف اس ڈر کو کہا جاتا ہے جو کسی پیش آنے والے واقعہ سے متعلق ہو۔۔۔ خوف اختلال کی ایک علامت ہے۔“ (۳)

اصل المیہ انسانی فطرت میں موجود خوف کے عناصر کی موجودگی کا نہیں، اصل المیہ انسانی فطرت میں موجود خوف کے غلط استعمال کا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ تمام گروپ کی تشکیل کی حرکیات اس قدر گہرے طور پر جڑی ہوئی ہیں کہ کیسے تھا اور مجھے واقعی خوف کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وقت اور جگہ میں گروہ بندی کی عالمگیریت ایک عقلی رجحان ہے۔ جتنا کہ فرائیڈ کو اپنے لیے بات کرنے دینا، فای لوجینیسس سے وراثتی جمع انسانی آزادی کے نتیجے کے طور پر ہم سیاسی برادریوں کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں جو کہ انسانی فطرت کا ایک گہرا تنازعہ ہے۔ اندر اور باہر خوف ہمیں اکٹھا کرتا ہے، اور اسی طرح کہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور محبت کی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دھماکہ خیز امتزاج ہمیں کہاں لے جاتا ہے، واضح ہے۔ جہاں اتنا حقیقی اور نفسیاتی دباؤ ہے، خوف میں جڑا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ فطری تسکین کو دبانے کے لیے، ہمارے خوف کے اور ہماری جارحانہ حکمت عملی یار د عمل، پاور پروجیکشن، تشدد اور جنگ کی شکل میں حقیقی آؤٹ لیٹس تلاش کرتا ہے۔

بلاشبہ Mearsheimer کے کیس کے برعکس، سیاسی حقیقت پسندوں کی ایک پرانی نسل کے لیے نفسیاتی اور سیاسی سوچ کی یہ تمام فرائیڈ پسند فلسفیوں کی حقیقی سیاسی حقیقت پسندی کے پیچھے استدلال کا مرکز رہی ہے۔ اس مسئلے پر جیسے نام نہاد کلاسیکی حقیقت پسندوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ جدید دور میں خوف کی پیداواری اور اس کے استعمال کے ذرائع کی مکمل وضاحت نہیں کرتا۔ خوف ہمارے لیے کم از کم کسی حد تک ایک تقریباً وجودی ضرورت ہے۔ ہماری فطری خواہشات کو گھر میں دبا دیا جائے۔ اور ظاہر ہے، اس بات پر مسلسل نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ جبر واقعی کتنا ضروری ہے۔ لیکن جس چیز کا ہمیں ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک بڑی تعداد میں ہمیں ہماری ناکام لغوی تحریکوں کو پیش کرے گا، خاص طور پر ہماری قوم پر طاقت، لذت اور وقار کا سب سے بڑا حصہ حاصل کرنا یعنی لوگ کسی قوم کے رہنما سے شناخت کریں گے، اور پھر یہی قومی رہنما، جسے ایک طاقتور باپ یا ماں کے طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے جارحانہ پہلو کے لیے حتمی راستہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ وہاں بین الاقوامی منظر نامے پر ہم اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس سے خوف اور باہمی خوف پیدا ہوتا ہے۔ اسی مثبت پہلو کو لے کر ڈاکٹر محمد یعقوب اس نکتے کو ایک اور پہلو سے ان الفاظ میں دکھاتے ہیں :

”خوف کی دو حالتیں ہیں۔ ایک پسندیدہ اور دوسرا ناپسندیدہ۔ دونوں میں فرق ہے۔ جب کوئی جسمانی یا سماجی خطرہ حقیقی طور۔۔۔۔۔ جہاز راں اور ہوا باز خوف کی حالت میں ہوتے ہوئے اپنا کام پورا کرتے ہیں۔ قدرت نے انسان کو ایسی قوتیں بخشی ہیں جن سے وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود جراتمند کارہائے نمایاں سرانجام دیتا ہے۔“^(۴)

یہ سب بہت قدیم اور آمرانہ اثر افیہ اور مردانہ لگتا ہے کہ فرائیڈ انسانی نفسیات کا دشمن نہیں ہے۔ لیکن پھر اس فرائیڈ کے نکتہ نظر سے، یہ ممکن ہے کہ نیوریلزم کے عالمی سیاست کے نظریہ کی بنیادی ساختی خصوصیت کی وضاحت کی جائے۔ انارکی۔ انسانی فطرت کو سطحی انداز میں تلاش کر کے نہیں، بلکہ حقیقت میں ذہنی کمالات کو انتہائی سطح پر استعمال کرنے میں ہے۔ اس کے بعد یہ سب ہمیں دوبارہ بیان کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ حقیقی سیاسی حقیقت پسندی کیسی نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے، خوف دونوں بین الاقوامی انارکی کی پیداوار ہے، اور خوف تجربہ کے تیسرے درجے پر اس قسم کا ڈھانچہ بناتا ہے اور دوبارہ بناتا ہے یا تیسری تصویر طرز عمل کے اس نمونے کے ذریعے جس میں خاص طور پر مورگینٹھاؤ اور برز کو اس کے مسخ ہونے کا خدشہ تھا: کنٹرول سے باہر ہونے والی غلط فہمیوں اور خود کو پورا کرنے والی پیشین گوئیوں کے ایسے: کے لحاظ سے خارجہ پالیسی سازی پر اثرات مختصر فرائیڈین خوف نفسیات کی انفرادی سطح پر ایک طاقتور جذباتی اور محرک عنصر کے طور پر گروہوں کی سماجیات کے لحاظ سے دوسری سطح پر گہری ساختیں تخلیق کرتا ہے، اور پھر تیسری سطح پر بھی جو بین الاقوامی سطح پر ساختی قوت ہے۔ انارکی جیسا کہ تھرنامج IR نظریات میں ہے پھر یہ ڈھانچے ہیں جو ریاستوں اور ان حالات میں رہنے والے لوگوں کی سوچ اور طرز عمل کا مشترکہ تعین کرتے ہیں۔

ایک حقیقی سیاسی حقیقت پسندی کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع کرنے کے لیے یوتھ 1991 شوکت اور بولنگ ورتی (۲۰۱۸)، یہ سوال ہے کہ کیا خوف اور جھنڈے اور قوم پرستی اور جنگ کے ایک شیطانی دائرے میں پھنس گئے ہیں؟ ساختی رجحان ایسا لگتا ہے: تخیل کی حقیقت پسندی پر مبنی خارجہ پالیسی ایک حماقت کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے، لیکن ان تمام چیزوں پر غور کیا جاسکتا ہے، وہ دلیل دیتے ہیں، ریاستوں کے پاس مقابلہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اقتدار کے لیے، جو ایک بے رحم اور خونی کاروبار ہو سکتا ہے۔ اس میں وہ مزید کہتے ہیں، صرف اس بات کو یقینی بنانے کے لیے حقیقت پسندی مستقبل؟ کے لیے! امید افزا نقطہ نظر کی تحریک نہیں دینی۔ یقینی طور پر سیاسی حقیقت پسندی کبھی بھی بین الاقوامی تعلقات کو تبدیل کرنے کے عظیم منصوبوں کے لیے موزوں نہیں رہی ہے، پھر بھی اس بات کی بہت کم وجہ موجود ہے کہ ہم ممکنہ طور پر حقیقت پسندانہ اقدام کو برقرار رکھیں جو کہ

عمل میں فروغ دینا ہے۔ ایک طرف فرائیڈ کا آر تھوڈو کس نظریہ سیاسی برادری اور بین الاقوامی انارکی کے تصورات کو ایک کرنے کے قابل ہے جو کہ ایک ساختیاتی قسم کی علمیات میں ایک حقیقت پسندانہ نفسیاتی انفرادی اور سماجی نفسیات ہے۔ دوسری طرف یہاں تک کہ اگر آپ فرائیڈ کو اس کے بدترین نفسیاتی تجزیہ کے طور پر لیتے ہیں۔ اس نے ایک بار بدنامی سے کہا، میں نے مجموعی طور پر انسانوں کے بارے میں بہت کم "اچھا" پایا ہے۔ کوئی بھی اسے استعمال نہیں کر سکتا، یا مناسب نہیں، اس کے لیے جو میں ریشمر کا فیصلہ کن مایوسی ہے اگر وہ قطعی طور پر متعصب نہیں، تو محمود سے متعلق متعصب (جھنم) حقیقت پسندی ہے۔ یقیناً یہ سب ماننے میں اچھے نہیں ہو سکتے جتنے کچھ لوگ ہمیں مانتے ہیں، لیکن پھر جیسا کہ فرائیڈ نے اشارہ کیا، ضروری نہیں کہ ہم اپنے جذبات کے آلام بھی ہوں لہذا، تمام سماجی اور سیاسی زندگی اسباب یا فطرت کا دائرہ نہیں ہے، بلکہ معمول اور ہنگامی کا دائرہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی نفسیات کس چیز کی اجازت دے سکتی ہے اور کن ساختی قوتیں حکم دے سکتی ہیں کے درمیان باریک سی جدوجہد میں، اس کے لیے کافی جگہ ہے۔ سیاسی طاقت اور امن کے لیے جدوجہد جو بہت سے طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ اچھے برے اور انسانی فطرت اور خوف کے بارے میں میں فرائیڈ نے جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، اس سے میں ایک قسم کی بے چینی کا شکار ہوں کہ چونکہ وہ اپنی جارحانہ حقیقت پسندی کی اصل جڑوں کی وضاحت نہیں کرتا، اس لیے اس کی سیاسی اور IR نظریہ سازی تجزیات سے زیادہ نظریاتی ہے۔ اور بدلے میں، ہم فرائیڈ سے جو کچھ چھین سکتے ہیں وہ خوف کی ایک قسم کی فرائیڈ کی حقیقت پسندی ہے جو عالمی سیاست میں ترقی اور تبدیلی کے امکانات اس سے کہیں زیادہ دیکھتی ہے جتنا کہ نیوریلٹ قبول کرنے کی پرواہ نہیں کرتے۔

اس باب میں جو چیز ہمارے پاس رہ گئی ہے وہ فرائیڈ کی سیاست اور طریقہ کار ہے۔ انارکی سے چھٹکارا پانے کے لیے مسلسل کام کریں اور دنیا کو یہاں کے لوگوں کے لیے ایک قسم کے بین الاقوامی قانون کے لیے محفوظ بنانے کی کوشش کریں۔ ایک کامل قسم کے آر تھوڈو کس سٹوکر م کے طور پر۔ فرائیڈ واقعی ہمیں راستے میں یہ بتاتا ہے خوف کو قبول کریں، لیکن کبھی بھی جذبات کے سامنے نہ آئیں، اور اس کے بجائے، خطرے کی صورت حال حقیقی یا تصوراتی سے نمٹیں۔ اپنی طاقت کا واضح اندازہ لگانا خام نفسیات کے زوال پذیر ستاروں میں سے ایک کے طور پر اپنی موجودہ ساکھ کے مستحق ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جس نے تجزیہ کی پہلی اور دوسری سطح پر نفسیاتی IR تھیوری لیڈر شپ اسٹڈیز کے منصوبے کے لیے صرف کچھ افادیت کو برقرار رکھا ہوا ہے؟ انسانی فطرت کے بارے میں مفروضوں کے حوالے سے نظریہ تنقید کے منصوبوں سے بڑھ کر ہم فرائیڈ کے نفسیاتی نظریہ کو یہ دیکھنے کے لیے ایک ممکنہ طریقہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں کہ عالمی سیاست میں خوف ڈھانچے کیسے بنتے ہیں۔

۲۔ خوف اور دہشت کے سماجی اثرات:

سماجی خوف یا ڈر اصل ایک خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت ہے، جس میں مبتلا فرد ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ ”لوگ صرف اسی کو دیکھ رہے ہیں اور اسی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“ یہ مسئلہ کسی بھی فرد کو ہو سکتا ہے بالخصوص ایسے افراد کو جنہیں ماضی میں کسی ناکامی کے بعد لوگوں کی جانب سے تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ ایسے میں انسان ہر وقت اس بارے میں خوف زدہ رہتا ہے کہ اگر وہ کچھ کہے گا، یا کوئی بھی کام انجام دے گا تو لوگ انہیں تنقید کا نشانہ بنائیں گے۔ اسی خوف میں جیتے ہوئے وہ لوگوں سے حتی الامکان کم تعلق رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص حقیقتاً Reserved یا کم گو شخصیت کا مالک ہو مگر عام طور پر جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو ان کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس سماجی خوف کی بیماری میں مبتلا نہیں بلکہ وہ بلا ضرورت بولنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جو لوگ سماجی خوف میں مبتلا ہوں وہ نہ صرف یہ کہ کم بولتے ہیں بلکہ بات کرنے سے کتراتے ہیں اور مختصر جواب دے کر موضوع کو Avoid کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوف کے وجوہات کے حوالے سے ڈاکٹر اے ای مینڈر کا نقطہ نظر کچھ یوں ہے:

”چار چیزیں ایسی ہیں جو خلقی اور جملی طور پر ہمارے خوف کا باعث ہیں۔ اول کسی بڑی چیز کا لیا ایک ہمارے سامنے آدھمکنہ جسے دیکھ کر ہم قدرتی طور پر سکتے یا بھاگ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوم ایک اچانک طور پر دھماکے کی آواز جو ہم میں خوف کے۔۔۔۔۔ احساس یا اپنے گرجانے کا خوف۔۔۔۔۔ یہ معلوم کرنا خالی ازدلچسپی نہیں کہ اس چار قسم کے فطری خوف کا تعلق وحشی آدمی کے ان زبردست خطرات سے ہے جن میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا تھا۔ دوسرے تمام خوف فطری نہیں بلکہ ہر آدمی کے ساتھ اس کی اپنی زندگی میں مثال، معلومات یا ذاتی تجربے کی بنا پر وجود میں آئے ہیں۔“^(۷)

۳۔ سماجی خوف کی علامات:

سماجی خوف کی علامات انفرادی ہیں، جو کہ مختلف وجوہات کی بناء پر مختلف ہو سکتی ہیں۔ بہر حال جو لوگ اس مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں ان میں یہ چند علامات عام طور پر مشترک پائی گئی ہیں۔

i۔ نفسیاتی علامات:

- ۱۔ کسی اجنبی سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ
- ۲۔ بات کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا

۳۔ گفتگو کا آغاز کرنے میں پریشانی

اور ایسے مواقع سے دور رہنے اور بچنے کی کوشش کرنا جہاں آپ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں۔ مثلاً تقریر، اسٹیج پر جانا، انٹرویو دینا وغیرہ۔ ملاقات یا کسی بھی صورت حال کے بعد یہ خیال کہ ہمیں فلاں فلاں بات کہنی چاہیے تھی وغیرہ۔

ii۔ جسمانی / ظاہری علامات:

مذکورہ صورتوں میں گفتگو کرتے ہوئے آواز ہلکی ہو جانا۔

۱۔ جسم گرم ہو جانا

۲۔ ٹانگیں کانپنا

۳۔ دھڑکن بڑھ جانا

۴۔ ہاتھ کانپنا

iii۔ عمومی علامات:

۱۔ آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے میں مشکل

۲۔ لوگوں کے سامنے کھانے سے گریز کرنا

۸۔ محفلوں میں جانے سے گریز کرنا

۳۔ دکان پر اشیاء واپس کرتے ہوئے شرمنا

۴۔ مختلف معاملات میں حد سے زیادہ Excuses (جواز) پیش کرنا

۵۔ دورانِ گفتگو الفاظ دبا دینا

اگر آپ کو ان میں اکثر (کم از کم ۵) مذکورہ کیفیات کا سامنا ہوتا ہے تو اس کا واضح مطلب ہے کہ آپ بھی سماجی خوف کا شکار ہیں اور آپ کو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اقدامات کرنے چاہیے۔

ج۔ سماجی خوف کی وجوہات:

دہشت گردی کا تاثر زندگی کے کسی خاص پہلو تک محدود نہیں ہے۔ دہشت گردی کا پورے معاشرے پر وسیع اثر پڑتا ہے جو کہ ایک فعال معاشرے کے معمولات کو متاثر کر کے اپنے باشندوں میں خوف اور دہشت پھیلاتا ہے خاص طور پر ان خطوں میں جن کی تاریخ دہشت گردانہ حملوں کے خطرے سے دوچار ہے۔ مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا، اور جنوب مشرقی ایشیا چند ایسے خطے ہیں جو اکثر دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ پاکستان ان سب

سے میں زیادہ تاثر ہونے والا ملک ہے۔ دہشت گردی کو عام طور پر تشدد یا دھمکیوں کے استعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا مقصد آبادی میں خوف کی عمومی فضا پیدا کرنا ہوتا ہے، جس کا مقصد ایک مخصوص سیاسی مقصد کو انجام دینا ہوتا ہے۔ دہشت گرد اکثر ایسے مقامات کو نشانہ بناتے ہیں جنہیں آسان ہدف سمجھا جاتا ہے جیسے کہ تعلیمی ادارے، کلب، نقل و حمل اور شاپنگ مالز کیونکہ ان جگہوں پر نسبتاً کم رسمی سیکورٹی اور آبادی کا ارتکاز بہت زیادہ ہے۔ پاکستان میں نرم اہداف خاص طور پر تعلیمی اداروں پر دہشت گردانہ حملے اکثر ہوتے رہے ہیں جن میں سے کچھ کے نتیجے میں بھاری جانی نقصان ہوا جیسے کہ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو پشاور کے آر می پبلک اسکول پر تباہ کن حملہ، جس میں ۱۴۵ معصوم اسکولی بچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے اساتذہ بھی مارے گئے۔ یہ پاکستان میں گزشتہ دو دہائیوں کے دوران تعلیمی اداروں پر ہونے والے متعدد خوفناک دہشت گرد حملوں میں سے ایک ہے (تفصیلات کے لیے انسانی حقوق کی رپورٹ دیکھیں)۔^(۸)

نوجوانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جو تیز رفتار سماجی، جسمانی اور نفسیاتی تبدیلیوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ تبدیلیاں جوانی میں زندگی کے دوسرے ادوار کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ہوتی ہیں۔ جنگ، تنازعہ، اور دہشت گردی کی کارروائیاں چند انتہائی تکلیف دہ اور چونکا دینے والے واقعات ہیں جو نہ صرف ان نوجوانوں کی روزمرہ کی زندگی متاثر کر سکتے ہیں بلکہ ان کے نفسیاتی کام کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں جب کہ وہ پہلے ہی مختلف سماجی، جسمانی اور نفسیاتی حالات سے گزر رہے ہیں۔ تبدیلیاں دہشت گردی اور تنازعات کے اس طرح کے واقعات معاشرہ میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتے ہیں جو بالآخر پریشانی، ڈپریشن، خوف اور ذہنی مسائل کا سبب بنتے ہیں۔

یہ منفی نتائج زندگی کے مختلف پہلوؤں پر وسیع پیمانے پر اثرات مرتب کر سکتے ہیں جن میں ان نوجوانوں کی بگڑتی ہوئی تعلیمی کارکردگی بھی شامل ہے جن کے اسکولوں کو ماضی میں نشانہ بنایا گیا تھا یا انہیں مختلف دہشت گرد گروہوں کے ممکنہ خطرات کا سامنا تھا۔ تعلیمی اداروں پر ممکنہ دہشت گردانہ حملوں کی اعلانیہ دھمکیاں پاکستان میں ایک عام بات بن گئی ہے کیونکہ یہ دہشت گرد تنظیمیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے وجود کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں۔ دہشت گردی جیسے تکلیف دہ واقعات صرف مخصوص خطوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا میں صحت عامہ کے بڑھتے ہوئے مسائل کا سبب بن رہے ہیں۔ اس مطالعے میں زیر نظر سیاق و سباق کی طرف رجوع کرتے ہوئے، ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کا خطرناک ماحول پاکستان کے خیبر پختونخوا اور بلوچستان صوبوں کے دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں میں رہنے والے نوجوانوں کی نفسیاتی صحت کو بری طرح متاثر کر سکتا ہے۔

نیوراتی شخصیت اور اس کے خوف کے بارے میں یونگ لکھتے ہیں:

”مختلف نیوراتی افراد کے کردار میں مختلف علامتیں ہوتی ہیں۔ بعض نیوراتی افراد میں طبی طور

پر اس کی علامات نہیں ہوتیں مگر وہ ایک ان جانے اور بے معنی خوف میں مبتلا ہوتے ہیں اور

اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتے ہیں۔“^(۹)

۱۔ عام طور پر سماجی خوف میں مبتلا ہونے کی وجہ خود اعتمادی کی کمی کے ساتھ ساتھ ممکنہ تلخ ماضی ہو سکتا ہے۔

۲۔ اسی طرح بعض طلباء کو سکول، مدرسہ یا گھر میں کہیں بھی تشدد (ذہنی، جسمانی، جنسی)۔

۳۔ جبکہ بسا اوقات اس کے پیچھے ہماری صحت کے مسائل بھی ہوتے ہیں۔ جسمانی کمزوری بالخصوص جسم میں زنک (Zinc) اور وٹامن B6 کی کمی سے بھی خود اعتمادی میں کمی اور نفسیاتی خوف کا سبب بنتی ہے۔

مثال کے طور پر کسی شخص نے کوئی کام انجام دینے کی کوشش کی لیکن کسی بھی وجہ سے وہ کام اتنے مہارت سے انجام نہ دیا جاسکا۔ ایسے تجربے کے بعد سننے والے تبصروں سے اگر اس شخص کے ذہن میں منفی اثر پڑتا ہے اور تو وہ اس کام کے متعلق خوف کا سبب بن جاتا ہے۔

د۔ سماجی خوف کے نقصانات:

سماجی خوف ہمیں بہت سارے سنگین قسم کے سماجی مسائل سے دوچار کرتا ہے اور یہ بے وقت اور بے جا خوف ہماری شخصیت کی پرورش، تعمیر و ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سماجی خوف پر بروقت قابو نہ پایا جائے تو اس کے درج ذیل سنگین نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ خوف سماج میں جمود کو طاری کرتا ہے جس کی وجہ سے سماج میں ترقی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ معاشرے اخلاقی اور معاشی سطح پر کمزور ہونے لگتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اس خوف کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دونوں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ کوئی بھی معاشرہ خواہ کس قدر خوشحال اور طاقتور کیوں نہ ہو ایک اگر اس میں کسی قسم کا خوف پیدا ہو جائے تو وہ معاشرہ آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ حافظہ کمزور ہونا

۲۔ خود اعتمادی بالکل ختم ہو جانا

۳۔ صلاحیت کے باوجود گمنام ہونا

۴۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں پیچھے رہ جانا

۵۔ مختلف معاملات میں بلاوجہ نقصان اٹھانا

- ۶۔ ڈپریشن
- ۷۔ کیریر میں نقصان
- ۸۔ شخصیت میں دوہریت (Duality) پیدا ہو جانا
- ۹۔ عمل کے بجائے خیالی پلاؤ / صرف منصوبے بنانے کی عادت
- ۱۰۔ منفی سوچ

۵۔ مجموعی جائزہ:

یہ بات تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جدید یورپ کی بنیاد، فرائیڈ، ڈاروون، نطشے اور آئن سٹائن نے رکھی ہے۔ گویا ان چاروں نے اپنے کام سے یورپ کی انفرادی و اجتماعی سوچ، عمل اور نظام کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ ان سب میں سب سے زیادہ زیر بحث فرائیڈ رہا ہے۔ جس کے کام نے فرد کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ فرائیڈ سے پہلے سماجی تشکیل اور ساخت میں فرد کو اس حد تک اہمیت نہیں دی جاتی تھی کہ فرد کو معاشرہ کی پہلی کڑی سمجھا جائے۔ جب کہ فرد کی نفسیات کے ساتھ ہی معاشرے کی نفسیات کا ادراک اس وقت کیا گیا جب فرائیڈ نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ جب کوئی فرد کسی معاشرہ کا حصہ بنتا ہے تو وہ معاشرے میں موجود تمام اچھے اور برے رویے اپناتا ہے، گو کہ یہ لاشعوری سطح پر ہوتا ہے مگر یہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ ساری عمر فرد اس ٹراما اور ان مسائل اور محرومیوں سے باہر نہیں نکل پاتا جن میں وہ بچپن سے واقف ہوتا ہے۔ دہشت گردی نے بھی اسی طرح فرد اور معاشرے کی نفسیات کو بے انتہا متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں ڈر اور خوف کے سائے مستقل ہو چکے ہیں۔ اس ملک کی تین نسلیں مسلسل خوف کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہیں۔ جن کی سوچ، فکر اور طرز عمل اس سانحے کے بعد مکمل ڈری ہوئی ہے۔ خیبر پختونخوا سب سے زیادہ متاثر ہونے والا صوبہ ہے جس کی آبادی نے سب سے زیادہ دہشت گردی کے عفریت کو جھیلیا ہے۔ اس صوبے کے لوگوں نے دہشت گردی کی وجہ سے اپنے گھر بار تک چھوڑ دیے ہیں۔ پاکستان میں سب سے زیادہ اس صوبے کے لوگوں نے نقل مکانی کی ہے۔ اس جنگ میں ہزاروں لوگ بے گناہ مارے گئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔

”دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے پہلے حصے میں پاکستانی افواج نے ۲۰۰۱ء سے لے کر ۲۰۰۹ء تک کئی چھوٹے آپریشنز کے ساتھ ساتھ کم از کم پانچ بڑے فوجی آپریشن کیے ہیں۔ آپریشن اینڈورنگ فریڈم (۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۲ء)، آپریشن المیزان (۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۶ء)، آپریشن زلزلہ (۲۰۰۸ء)، آپریشن شیر دل، راہِ حق، راہِ راست (۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۰ء) اور

آپریشن راہ نجات (۲۰۰۹ء تا ۲۰۱۰ء)۔ پاکستان ستمبر ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۹ء تک ان فوجی آپریشنز کی وجہ سے مجموعی طور پر ۴۵ بلین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جس کے براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کے نقصان، سرمایے کی کمی، آپریشنز والے علاقوں میں صنعتوں کی بندش کی صورت میں مجموعی معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔“^(۱۰)

ان تمام مسائل کا بوجھ بختون خوا کی عوام نے اٹھایا۔ کیونکہ یہ صوبہ دہشت گردی کے خلاف فرنٹ لائن پر تھا۔ قتل و غارت، بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان، بھتہ خوری، منشیات فروشی، اسلحہ کی سمگلنگ، غرض ہر طرح کا مسئلہ اس صوبہ کا بنیادی مسئلہ تھا اور یہی صوبہ ان مسائل سے سب سے زیادہ متاثر بھی ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کے بعد، ایشیا میں یہی دوسری بڑی نقل مکانی تھی۔ جس میں لاکھوں لوگوں نے اپنے گھر بار چھوڑے اور اپنے خاندان کی جان بچا کر دور دراز کے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔

دہشت گردی کی کارروائی کو انجام دینے کا عمل کسی ایک لمحے کے الہام سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک پیچیدہ عمل سے پیدا ہوتا ہے جو علمی رہائش اور جمع ہونے والے قدموں پر انضمام ہوتا ہے۔ دہشت گردوں کو پاگل یا سائیکو پیچہ کا لیبل لگانا غلط طور پر تخفیف پسند ہے۔^(۱۱) دہشت گردوں کے محرکات میں ذاتی معنی اور اہمیت کی گہری، بنیادی جستجو شامل ہو سکتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس طرح کے محرکات کے کئی تجزیے سامنے آئے ہیں۔ ان تجزیوں میں دہشت گردی کے لیے اہم کے طور پر شناخت کیے جانے والے محرک عوامل کی قسم اور مختلف قسم کے حوالے سے اختلافات ہیں۔ کچھ مصنفین نے ایک واحد محرک کو اہم قرار دیا۔ دوسروں نے محرکات کا ایک 'کاک ٹیل' درج کیا۔

سیاسی چیلنجوں کے ساتھ مل کر سماجی و اقتصادی مشکلات کا اوسط پاکستانی کی نفسیات پر نقصان دہ اثر پڑے گا۔ ایک دہشت گرد اپنے متاثرین کی شناخت کے لیے ایک متضاد طریقہ اپناتا ہے، سیاہ اور سفید خیال کہ 'میں اچھا ہوں' اور 'تم برے ہو'، جس میں کوئی درمیانی رنگ بھوری رنگ نہیں ہے۔ یہ سوچ ان کے ذہنوں میں کوئی شک نہیں چھوڑتی اور وہ اپنے مخالفین کو کم یا بغیر کسی پچھتاوے یا جرم کے احساس کے ساتھ مارنا آسان سمجھتے ہیں۔ بغیر پائلٹ کے ڈرون حملوں نے پاکستان کے غریب علاقوں میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کو ہلاک اور معذور کر دیا۔ اس نے لوگوں کو مشتعل کیا، جس کی وجہ سے وہ سمجھے جانے والے حملہ آوروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے لگے۔ مرنے والوں کے لواحقین کا اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہونا پاکستان میں انتقام کا کلچر ہے، جو بد قسمتی سے نسلوں تک قائم رہ سکتا ہے۔

خود قربانی اور شہادت کو تقریباً تمام مذاہب میں واضح طور پر استعمال کیا گیا ہے اور دہشت گرد تنظیموں کے ذریعہ اس کا جارحانہ طور پر استحصال کیا جاتا ہے جو اسلامی شہادت کے نظریے کو استعمال کرتے ہوئے خود کش بمبار تیار کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ خود کش بمبار درحقیقت طبی طور پر خود کشی کر سکتے ہیں اور ذاتی تعطل سے بچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ نوجوان متاثر کن نوجوانوں کو تیار کرنے میں، انتہا پسند تنظیمیں ان نوجوانوں کو یہ یقین دلانے کے لیے برین واش کرتی ہیں کہ خود کش بم دھماکے کے ذریعے ان کی حتمی قربانی خدا کی نظر میں ان کے قد کو بلند کرے گی اور انہیں سیدھے جنت میں بھیج دے گی۔ اس کا تعلق متوفی کے خاندان کو بڑے پیمانے پر مالی معاوضے سے ہے۔ پاکستان میں دہشت گرد تنظیمیں، برین واشنگ کے اس عمل کے ذریعے، نوجوان متاثر کن مسلم نوجوانوں کو چھ ہفتوں میں 'خود کش بمبار' میں تبدیل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ کے موجودہ منظر نامے میں نوجوان، نوجوانوں کو خود کش بمباروں کے طور پر بھرتی کرنے کا یہ پیچیدہ عمل ناقابل واپسی لگتا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ وڈور تھ، بحوالہ ڈاکٹر چودھری عبدالقادر، نفسیات، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۲۳
- ۲۔ جمیز لینگ، بحوالہ ڈاکٹر چودھری عبدالقادر، نفسیات، ص ۲۲۳
- ۳۔ محمد یعقوب، ڈاکٹر، نفسیاتی خوف اور ان کا علاج، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، سن، ص ۶۰۹
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۸
- ۵۔ اے ای مینڈر، ڈاکٹر، ہماری نفسیات، مترجم: شیدا محمد، دہلی، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۳۹ء، ص ۲۳
- ۶۔ یونگ، بحوالہ ڈاکٹر، محمد یعقوب، نفسیاتی خوف اور ان کا علاج، ص ۷۹
- ۷۔ اے ای مینڈر، ڈاکٹر، ہماری نفسیات، مترجم: شیدا محمد، دہلی، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۳۹ء، ص ۵۶
- ۸۔ Watch H.R. "Dreams Turned into Nightmares" Attacks on Students, Teachers, and Schools in Pakistan.
- ۹۔ یونگ، بحوالہ ڈاکٹر، محمد یعقوب، نفسیاتی خوف اور ان کا علاج، ص ۷۹
- ۱۰۔ <https://wenews.pk/news/27351/>
- ۱۱۔ محمد یعقوب، ڈاکٹر، نفسیاتی خوف اور ان کا علاج، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، سن، ص ۲۱۵

باب دوم:

خیر پختونخوا کے منتخب معاصر ادو افسانے میں خوف کے عناصر

خوف ایک قدیم اور محفوظ رد عمل ہے جو تہذیب کی آمد سے پہلے انسانوں کی کافی خدمت کرتا تھا، لیکن یہ جدید معاشروں میں مسخ ہو چکا ہے جہاں ابتدائی خوف آسانی سے فوبیا میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ زیادہ وجودی سطح پر، انسانی تہذیب کے عروج کے ساتھ موت کا خوف تیزی سے پھیلتا چلا گیا اور ابدی زندگی اور خیر خواہ دیوتاؤں پر عقائد رکھنے والے مذاہب کی ترقی کا ایک اہم عنصر تھا۔ خوف کے منفی نتائج، جیسے کہ پارنویا اور تنہائی، کو فلسفیوں اور ماہرین عمرانیات نے صدیوں سے تسلیم کیا ہے۔

معاشرہ خوف پیدا نہیں کرتا، وہ انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ معاشرہ لوگوں کے بہت سے گروہوں سے تعلق رکھتا ہے جو "خوفزدہ" ہیں۔ خوف، میری پوری ایماندارانہ رائے میں، قدرتی نہیں ہے۔ یقیناً مجھے اس کی پشت پناہی کرنے کے لیے ایک دو کہانیوں کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہوگی، لیکن فی الحال میں صرف جواب دوں گا۔ خوف کی تین قسمیں ہیں، واقعات کا خوف، جذبات کا خوف (جس کا تعلق رویے سے ہے) اور ان چیزوں کا خوف جن کو ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ معاشرے سے ڈرتے ہیں۔ بہت سے لوگ معاشرے سے نفرت اور صرف نفرت کرتے ہیں۔ ہر قسم کے مصنوعی نقطہ نظر کا سبب بننا۔ وہ فخر کرتے ہیں اور ان خوف میں اضافہ کرتے ہیں جو ان کی زندگی کے تقریباً روزمرہ "موت" سے متعلق ہیں۔ لیکن اگر وہ حقیقت میں موت کے مقابلے میں نصف ہیں، تو وہ زیادہ ہوشیار لوگ ہوں گے۔ ہمیں سہولت اور سادگی کی زندگی سے چمٹے رہنا سکھایا جاتا ہے، تاکہ وہ کبھی صحیح سوال نہ کریں۔

نفیات دان خوف کو سائنسی انداز میں دیکھتے ہیں۔ یہ کام سماجیات اور ثقافتی مطالعات کے درمیان سرحد پر کھڑے ہوتے ہوئے اور خوف کے نفسیاتی تصور کے ساتھ کام کرتے ہوئے، ایک بین الضابطہ نقطہ نظر سے خوف کے تصور کی جانچ کرتا ہے۔ یہ خوف کو اضطراب سے مختلف طور پر بیان کرتا ہے اور خوف کے نئے ذرائع کا جائزہ لیتا ہے، جنہیں خوف کے مخصوص سماجی و ثقافتی محرکات کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ بالکل سماجی ثقافتی اور خوف کا حالاتی تناظر ہے جو خوف کے تجربات اور اس سے نمٹنے کے دوران کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ کام کی بنیادی توجہ بنیادی طور پر بیک، فریڈی اور گڈنز کی تحریروں سے ہوتی ہے اور خوف کی سماجی و ثقافتی وجوہات کی نقشہ سازی پر مرکوز ہے۔ یہ عصری خطرات کے مخصوص تصورات کا بھی جائزہ لیتا ہے جیسے خوف کی نئی محرکات جبکہ عصری مغربی معاشرے میں

ان کے ذرائع کو بھی ظاہر کرتا ہے، جس کی خصوصیت ایک عالمی خطرے والے معاشرے کے طور پر ہوتی ہے، جس میں خوف کی ایک مخصوص ثقافت ہے۔ نئے خوف کے محرکات بنیادی طور پر ماہرین میڈیا کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ اپنے آپ میں، خوف ایک پرکشش شے ہے (خبریں، سنیما) اور اس میں مطلوبہ صارف یا ووٹر کے رویے کو بھڑکانے کی صلاحیت بھی ہے۔ فرد کو پہلے سے زیادہ خوفناک معلومات کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اسے حفاظتی مصنوعات اور خدمات کی خریداری، انشورنس، صحت کی مصنوعات، قانونی خدمات، ماہرانہ مشاورت، اور ان سیاست دانوں کے لیے ترجیح کی طرف ترغیب دینے پر مبنی حکمت عملیوں کی پیشکش کی جاتی ہے جو میڈیا سے پیدا ہونے والے ان خوف کو سنبھالنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

الف۔ شناخت کا خوف:

خوف کی تعریف کرنا آسان نہیں ہے۔ خوف کی متعدد مخصوص تعریفیں ہیں، جو انفرادی نمونوں کی بنیاد پر سامنے آئی ہیں جن میں خوف پایا جاسکتا ہے۔ خوف کی ایک عالمگیر تعریف، جسے مختلف شعبوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، ممکنہ طور پر ابھی تک نہیں بنایا گیا ہے۔ خوف کی عالمگیر تعریف فراہم کرنے کی حالیہ کوششوں میں سے ایک اس بیان کے ساتھ ختم ہوئی، "یہ میرا یوس کن نتیجہ ہے کہ موجودہ وقت میں خوف کی تعریف نہیں کی جاسکتی"۔ خوف کی وضاحت سے وابستہ مشکلات ایک بین الضابطہ انداز میں تصور کو سمجھنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہیں: میتھن اس پر "جذبات کے مطالعہ میں استعمال ہونے والے طریقوں کا تصادم" کے طور پر تبصرہ کرتے ہیں ارتقائی نقطہ نظر سے، وہ تضادات اور تضادات جو نسلی ماہرین اور ماہرین نفسیات کے طریقہ کار کے خوف کے تصور سے موازنہ کے دوران سامنے آتے ہیں۔ حیاتیاتی عالمگیروں کے درمیان خوف کو کیٹلاگ کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور میتھن نے اپنے خاص طور پر فکر انگیز متن کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا: "خوف کی حیاتیاتی تعریف کی بنیاد کو پیش کرنا واقعی تجرباتی سائنس کا کاروبار ہے، اور اس کا نتیجہ فلسفیوں اور دانشوروں کی نظر میں مکمل نہیں ہو سکتا۔

جینز اور ماحولیات، حیاتیاتی اور سماجی علوم، سیکھنے کا نظریہ اور منشیات کی لت کی پیچیدگیاں، ہارمونز اور نیوران، شخصیت کے خصائص اور سائیکوپیتھولوجی، اس طرح، ان سب سے خوف کا مطالعہ ممکن ہے۔ ان نقطہ نظر کے مطابق خوف بلاشبہ ایک ایسا جذبہ ہے جس پر نفسیات انتھک توجہ دیتی ہے اور باسووٹز، کیٹل، فرائیڈ، آئزارد، لازارس، لیویٹ، پلپک، سپیلبرگر اور وائٹن جیسے ناموں کا تعلق اس شعبے کے دیو قامت افراد میں سے ہے اور اس جذبات کے مطالعہ کے دوران ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ Drvota اور Vymětal کا تعلق مصنفین میں سے ہے، جنہوں نے اس موضوع کے مطالعہ کے لیے خاص کوششیں کی ہیں۔ مؤخر الذکر خوف کی تعریف کرتا ہے:

”کسی خاص چیز یا صورتحال سے منسلک ایک ناخوشگوار تجربہ، جو فرد میں خطرے سے متعلق تشویش پیدا کرتا ہے۔ اس طرح، یہ معلوم خطرات کا رد عمل ہے اور اس کا سنگنگ اور دفاعی فعل ہے۔ ایک تجربے کے طور پر، جذبات میں تناؤ، بے چینی، جکڑن اور یہاں تک کہ فالج بھی شامل ہے۔“^(۱)

خوف کے مطالعہ کے لیے ممکنہ طور پر آسان ترین نقطہ نظر بنیاد پرست طرز عمل کے ماہرین پیش کرتے ہیں، جو ممکنہ طور پر خوف کی اصطلاح کے بغیر بھی ایسا ہی کریں گے اور اس کے بجائے بچنے والے رویے پر انحصار کریں گے۔ خوف کو اجتناب کے رویے کے طور پر بیان کرنے کی کوشش عام طور پر اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ بنیاد پرست طرز عمل کرنے والوں کے لیے بہت خوش آمدید، جو محرک اور رد عمل کے درمیان کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل خوف کا تصور، کیونکہ ہم ہمیشہ اس کے بجائے بچنے والے رویے کی بات کر سکتے ہیں۔ تو کیا خوف کی اصطلاح واقعی غیر ضروری ہے؟ جب تک ہم محض محرک رد عمل کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتے ہیں، ہم خوف کی اصطلاح کے بغیر کر سکتے ہیں۔ بنیادی سوالات، جن سے ہم خوف کا مطالعہ شروع کرتے ہیں، کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ کون سے حالات ہیں جو خوف کو جنم دیتے ہیں؟

۲۔ وہ کون سی شرائط ہیں جو خوف، یا خوف کی حساسیت کو متاثر کرتی ہیں؟

خوف کو دماغ کی نہیں، بلکہ نیوروائینڈوکرائن سسٹم کی حالت کے طور پر ماننا "کو ترجیح دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہم متفق ہیں۔

ب۔ خوف کے ذرائع:

میری تحقیق بنیادی طور پر خوف کے نئے ذرائع پر مرکوز ہے، جسے ہم خوف کے مخصوص سماجی و ثقافتی محرک کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک دیئے گئے سیاق و سباق میں، یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم بنیادی طور پر پہلے اور جزوی طور پر خوف کے مطالعہ کے لیے گرے کے تجویز کردہ تین مختلف طریقوں میں سے دوسرے کے ساتھ فکر مند ہیں:

پہلا، یہ سوال ہے کہ کون سے محرکات فطری طور پر خوف پیدا کرتے ہیں؟

دوم، یہ سوال ہے کہ خوف کی حالت میں رویے کی کون سی شکلیں فطری طور پر ہوتی ہیں۔

تیسرا، یہ سوال ہے کہ کس حد تک کسی فرد کی خوف کے لیے حساسیت کا تعین موروثی یا

ماحول سے ہوتا ہے؟

بہر حال، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل تیسرا طریقہ ہے جو مزید تجرباتی تحقیق کے لیے ایک دلچسپ امکان پیش کرتا ہے۔

قدیم ترین ذرائع میں سے، یہ یقینی طور پر اپنے آپ کو خوف کی ایک غیر معروف ٹائپولوجی کی یاد دلانے کے قابل ہے:

۱۔ خوف جس میں جبلت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۲۔ خوف جو کسی دردناک احساس کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

۳۔ کسی تکلیف دہ یا غیر متفق خیال یا عقیدے کی وجہ سے خوف

جامد اور غیر متزلزل خوف، جن سے اکثریت خود فکر مند ہے، اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: اونچی جگہوں اور گرنے کا خوف؛ واقفیت کھونے کے؛ قربت، آسانی اشیاء؛ اندھیرے کا، تنہائی کا، پانی کی؛ ہوا، آگ، گرج اور بجلی؛ جانوروں کی؛ آنکھوں کی؛ دانتوں کی؛ کھال کا پنکھوں کی؛ بیماریوں کی؛ موت کا؛ دنیا کے اختتام کا، بھوت؛ غربت کا، وغیرہ وغیرہ۔

ج۔ خوف کا مقابلہ کرنا:

اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے انسان کی کوششیں اتنی ہی پرانی ہیں جتنا کہ خود انسان۔ تاہم، خوف سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن اور قطعی طور پر غیر فطری ثابت ہوا ہے۔ خوف کے خلاف تحفظ کی ایک قسم کے طور پر فعال تلاش انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ انفرادی انسان کی تاریخ کا ایک بنیادی جزو ہے۔ بہر حال، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے کچھ ایسی مہارتیں ضرور پیدا کر لی جو خوف کے خلاف کام کرتی ہیں اور ان کو منظم کرنے میں مدد کرتی ہیں: ہمت، اعتماد، عزم، طاقت، امید، عاجزی، ایمان اور محبت۔ مافوق الفطرت، مذہب اور سائنس بھی مدد کرتے ہیں، وہ مشورہ دیتے ہیں، انتظام کرتے ہیں اور خوف کا مقابلہ کرتے ہیں۔ عالمگیر معنوں میں، یہ بیان کرنا ممکن ہے کہ مقابلہ کرنے کی حکمت عملی بنیادی طور پر اضطراب سے متعلق ہے نہ کہ خوف سے۔ اگر میں نہیں جانتا کہ میں کس چیز سے ڈرتا ہوں، تو میں خوف کا نہیں، پریشانی کا سامنا کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خوف اور اضطراب کے درمیان ایک واضح حد طے کرنے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ جہاں خوف لازمی طور پر یقینی خطرات سے متعلق ہوتا ہے، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ اضطراب کو ہمیشہ غیر معینہ خطرات سے دوچار ہونا چاہیے۔ یہ یقینی خطرات کے ساتھ بھی تجربہ کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ خطرات جن کے بارے میں، میں جانتا ہوں کہ وہ کیا ہیں، بشرطیکہ ان میں کچھ غیر یقینی صورتحال ہو۔ اضطراب درحقیقت غیر یقینی صورتحال کا رد عمل ہے یا تو واقعات کے نتائج، یا کیے

جانے والے اقدام، یا کسی کی پیشین گوئی کرنے یا حقیقت پر عمل کرنے کی طاقت، یا کسی کی چوٹ برداشت کرنے کی صلاحیت۔ اگر ہم خوف کے انفرادی اسباب کو ان معنوں میں الگ کرنا چاہتے ہیں جن پر ہم نے بحث کی ہے، تو اپنے نفس کو خوف سے نجات دلانے کا مطلب بھی اس کے اسباب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اس طرح، دشمن کے خوف سے جان چھڑانے کا مطلب ہے یا تو اس دشمن سے جان چھڑانا یا اس شخص کو یا دشمن کے طور پر سمجھنا چھوڑ دینا۔ نامعلوم کے خوف کو دور کرنے کا مطلب ہے کہ اس حالت کو کسی اور جانی پہچانی چیز میں تبدیل کرنا وغیرہ۔ سیلاب، کار حادثے یا امتحان پر خوف کا اظہار کرنا مکمل طور پر فطری ہے، جب تک کہ ان واقعات کا براہ راست اثر اس شخص پر پڑتا ہے جوڑتا ہے۔ انہیں دھمکی آمیز معلومات کو دبانے اور ان سے گریز کو خوف سے نمٹنے کی حکمت عملی کے طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کو اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے، اسے یہ فرق کرنے کے قابل ہونا چاہیے کہ کون سے خوف حقیقی خطرے کی نمائندگی کرتے ہیں اور کون سے نہیں۔ ایک ہی وقت میں، مختلف فطری عوامل اور سماجی و ثقافتی سیاق و سباق، جہاں ایک فرد کی زندگی ہوتی ہے، وہ بھی ایک اہم عنصر ہیں۔

د۔ افسانہ نگاروں کے ہاں خوف:

ادب اور نفسیات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مختلف ماہرین نفسیات نے ادب کی تخلیق میں انسانی نفسیات کے کردار کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب رہے ہیں۔ فرائیڈ کے مطابق ہماری زیادہ تر خواہشات شعور میں داخل نہیں ہوتیں بلکہ لاشعور میں رہتی ہیں۔ سماجی دباؤ یا جبر کی وجہ سے ہم احساسات اور جذبات کو شعور سے نکال دیتے ہیں۔ یہ احساسات اور جذبات غائب نہیں ہوتے بلکہ لاشعور میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ظہور کی تمنا کرتے رہتے ہیں۔ جب ان رجحانات کو کوئی براہ راست ذریعہ نہیں ملتا ہے، تو یہ مختلف پوشیدہ ذرائع سے ظاہر ہوتے ہیں۔ خواب، روشن خواب، فریب اور ادب لاشعور کی مبالغہ آمیز اور دبی ہوئی خواہشات کی تسکین کے لیے ہتھیار ہیں۔ ان سب میں ادب ایک صحت مند اور سماجی طور پر قابل قبول رویہ ہے۔

ادب انسانی جبلت کا اظہار ہے۔ دبایا ہوا ادب اور ہماری جبلت وہ تخلیقی اظہار کے ذریعے اطمینان پاتے ہیں۔ ایک تخلیق کار میں عام انسانوں کے مقابلے میں غیر معمولی تخیل اور شعور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی خواہشات کا دباؤ، نوعیت اور اظہار مختلف اور شدید ہے۔ اس شدت سے نمٹنے کے دو ہی طریقے ہیں: اسے فنکار یا تخلیق کے ذریعے جاری کریں، یا جنون کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ مصنف کی فنکارانہ صلاحیت پر منحصر ہے۔ کسی حد تک اس اظہار کو فن کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ایڈلر تخلیقی عمل کو انفرادی سطح پر اجتماعی لاشعور سے جوڑتا ہے۔ جینیاتی ارتقاء کے دوران، انسانوں کو اپنے آباؤ اجداد سے بہت سی چیزیں وراثت میں ملی ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری سطح پر اپنے اسلاف کے اثرات کو قبول کرتا ہے اور اس ثقافتی اور تاریخی بیداری کا اظہار ایک طرح کے فن کے

ذریعے ہوتا ہے۔ ڈونگ کے مطابق ادب ایک تکمیلی عمل ہے۔ اس میں فنکار تمام بنی نوع انسان کی عمر کے مخصوص نقائص کو دور کرنے اور انہیں فنی سطح پر متوازن کرنے کی شدید خواہشات کو ظاہر کرتا ہے۔ لاشعوری ذہن انسان کی تخلیقی اور تخریبی روح کا سرچشمہ ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ایڈلر احساس کمتری کو ادب سے جوڑتا ہے۔ ان کی رائے میں احساس کمتری کی تلافی ادب کا نصب العین ہے۔ فرائیڈ اور جنگ کی طرح ایڈلر کے لیے بھی تخلیقیت ایک ذہنی مجبوری ہے۔ احساس کمتری کی تلافی شعور کی بجائے لاشعوری ہے، اور اسی لیے ادب کو لاشعور کا مظہر بھی کہا جاتا ہے۔ ایڈلر شعوری اور لاشعوری کے درمیان فرق کو مصنوعی قرار دیتا ہے، لیکن ذلت کے معاوضے کے موضوعی اور داخلی پہلو پر زور دیتا ہے، جو لاشعور کی اہمیت کو روشن کرتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق ادیب احساس کمتری کا شکار ہو کر دوسروں کا دل جیتنا چاہتا ہے۔ اقتدار کی یہی خواہش تخلیقی عمل کا محرک ہے۔ نرگسیت، خود غرضی اور فنکاروں کی آزادی کا تخلیقی صلاحیتوں سے گہرا تعلق ہے۔ ایڈلر کے مطابق مصنفین بنیادی طور پر خواب دیکھنے والے ہوتے ہیں اور انہیں عموماً معاشرے میں وہ مقام اور رتبہ نہیں ملتا جس کے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے مستحق ہیں، اس لیے ان میں نرگسیت پروان چڑھتی ہے۔ وہ آج بھی اپنی ذات میں قید ہیں۔ فنکار کا خیال ہے کہ اگر عام معاشرہ عملی زندگی میں اس کی عظمت کو نہ پہچانے تو وہ تخلیقی سطح پر اپنا مقام کھو چکا ہے۔ جنسی بے چینی اور احساس کمتری دونوں ہی ادب کے محرکات ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی ذاتی زندگی سے محرومی ہی ادب کی تخلیق کا ذریعہ ہے۔

فنکار کی خوبی یہ ہے کہ وہ قدرتی مظاہر اور انسانی مظاہر کی تصویر کشی اور بیان کر سکتا ہے جسے عام لوگ سمجھنے اور بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ تخلیق کار نہ صرف معاشرے کی بے ساختہ شناخت کرتے ہیں بلکہ ان کے ترجمان بھی ہوتے ہیں۔ فنکار اپنی فنی تخلیق میں خود کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کا معاشرہ، ماحول اور ثقافتی اور افسانوی عناصر لامحالہ باطنی سطح پر اس کی تخلیق کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق فنکار کی ذاتی زندگی، حالات اور معلومات بہت اہم ہوتی ہیں۔ اور ان کا مطالعہ کرنے سے ان کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ فنکار کے تخلیقی عمل میں اجتماعی لاشعور، معروضی دنیا اور ذاتی خواہشات اہم ہیں۔ ادب انسانوں کا مطالعہ ہے اور انسانی نفسیات کے پوشیدہ گوشوں سے نمٹنے کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ مصنف اپنے اندرونی انتشار کو بیرونی انتشار سے ملا کر ادب تخلیق کرتا ہے۔ اسے سمیٹ کر اور اسے ثانوی تصورات میں ڈھال کر، وہ ساری دنیا کے درد کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ خوف کا بغور تجزیہ کرنے سے ثابت ہوا کہ خوف کی اصل، اس کے اسباب و اثرات سب

لوئی جوی اور بیریر آف فیر جیسے شاہکار ابھرتے ہیں۔ کاچو خیل نے مذکورہ دونوں کہانیوں کی بڑی مہارت سے عکاسی کی ہے اور انسان کی شعوری زندگی میں مادی زندگی اور روحانیت کے باہمی منظر کو بیان کیا ہے۔ اپنے موضوعاتی مواد کی بنیاد پر ان کہانیوں کو بہترین کہانیاں کہلانے کا اعزاز حاصل ہے اور یہ موجودہ دور میں سانس لینے والے انسان کی جذباتی اور حسی کیفیت کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔

جہاں تک ”جن اور انس“ کا تعلق ہے تو یہ کہانی اس سیریز میں ایک مختلف مزاج اور مختلف انداز کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا منظر نامہ ملک عزیز اور اس کے مکینوں کی مقامی اور تاریخی دونوں لحاظ سے سماجی، معاشی اور مذہبی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے۔ بنیادی طور پر اس کہانی میں ترقی پذیر ممالک پر عالمی استعمار کی گرفت، جابرانہ تسلط، مقامی سرحدوں کے پس منظر میں سیاسی مداخلت کے وحشیانہ استحصال کو اس طرح سے زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسے ادبی سمجھا جاسکے۔ محمد جمیل کاچو خیل عام طور پر اپنی کہانیوں میں علامتی اظہار پر انحصار برداشت نہیں کرتے، تاہم لیکچر میں علامتی بھرتوں کی نمائندگی کا نمونہ بدل گیا ہے۔ علامت نگاری، میری رائے میں، مقررہ معنی سے گریز کرتے ہوئے، مطلوبہ منتقلی کو دیا جانے والا نام ہے۔ آمرانہ حکومت والے ممالک میں بھی اب اس جملے کو نظر انداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کاچو خیل کا محمد جمیل کے جنوں اور انسانوں کے لیے علامتی اظہار کا انتخاب اس لیے ہے کہ، ان کے مطابق، اس کہانی میں پیش کیے گئے سیاسی ذیلی متن کے صحافتی مواد کو ادبی میڈیم میں پیش کیا جانا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم نے اس کہانی میں پیش کیا ہے۔ ان کی علامتیں اتنی بولڈ یا مبہم نہیں ہیں کہ وہ مواصلاتی مسائل کا باعث نہ ہوں۔ اتنی ہمدردی اور خلوص کے ساتھ انھوں نے نظریاتی اور فکری طور پر حساس مسائل کو اٹھایا ہے کہ ہر پاکستانی محب وطن کو ان کی کہانی پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ بعد میں معنی کی ایک نئی دنیا سامنے آتی ہے۔

اس طرح جمیل کاچو خیل کا ایک افسانہ جس کا عنوان ”انسان کہیں کا“ ہے۔ اس میں ایک غریب پٹھان عبدالصمد اور اس کے وفادار کتے کی کہانی بتائی ہے۔ اس افسانے میں انسان کو مطلب پرست اور لالچی دکھایا گیا ہے۔ کہیں کہیں کتے کے علامتی انداز میں پاکستان کی بے بس اور غریب عوام کو پیش کیا گیا ہے جو اپنے مالک کے ظلم و ستم اور بے وفائی سے اتنی ہی تنگ ہے جتنا یہ کتا۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ عبدالصمد ایک غریب پٹھان ہے جس کی بہت ساری اولاد ہے۔ اس کے گھر میں ایک کتا ہے جس کا نام لٹور کھا گیا ہے۔ لٹو اپنی جسامت کے حوالے بہت چھوٹا ہے مگر اپنے مالک کا انتہائی وفادار ہے۔ ایک دن صمد کا بیٹا باہر کھیل رہا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ یا اس پر حملہ کر دیتا ہے، جبکہ لٹو پاس ہی کہیں سے یہ دیکھ کر دوڑتا ہوا بچے کی طرف آتا ہے اور بھیڑیے سے مڈ بھیڑ ہو جاتا ہے۔

قوم کو ایک فرد کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ آدمی جمال پسند ہے۔ خوبصورتی کا دیوانہ ہے مگر اس کے باطن میں ایک خوف ہے ایک مہیب ڈر، جو ہر وقت اس پر طاری رہتا ہے۔ یہ آدمی اپنی زندگی کو بہتر اور خوبصورت بنانے کے لیے لاکھ جتن کرتا ہے مگر اس خوف سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اس افسانے کا اختتامی منظر کچھ یوں ہے:

”اچانک اُس کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی پرندے ایک بھیانک پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ایک ساتھ اُڑنے لگے پھر ایک مہیب اور کان پھاڑنے والی چنگھاڑ سنائی دی۔ جس کی وجہ سے وہ کشش ثقل سے کچھ دیر کے لیے آزاد ہو گیا اور اُچھل کر دور جا گرا۔ جیٹ فائٹروں کے دو سکوارڈن ممکنہ حد تک نیچی پرواز میں، آواز کی رفتار سے کئی گنا تیز اُڑ رہے تھے۔ وہ اُٹھا اور دھپ سے پھر زمین پر گر گیا۔۔۔ اس کے خوف نے آج اس کے لاشعور سے شعور میں آتے ہوئے اپنی رفتار کا بیرئیر توڑ ڈالا تھا۔“^(۵)

ثقافت اور تہذیب کی تیزی کے ساتھ رویوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ لہذا، جو لوگ قدیم اقدار کا سانس لیتے ہوئے پروان چڑھے، انہیں یہ تبدیلی ناگوار معلوم ہوئی اور اجتماعی انسانی نفسیات پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اکیسویں صدی میں یہ تبدیلی اس قدر پر تشدد طور پر ہوئی کہ حساس لوگوں کو یہ ناگوار گزرا۔ علی اکبر کی مہاکاوی ”شاہ محمد کاٹینگا“ اسی تناظر میں لکھی گئی، سیدزیر شاہ کی مہاکاوی ”بین کرتی میا“ بھی ایک نوحہ ہے، نئی تہذیب میں مصنوعی رویوں والی نسل پر گہرا طنز ہے جس کی ان میں کمی ہے۔۔۔ روف نیازی اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

”افسانہ نفسیاتی عدم توازن کا کرب "Dedipus complex کی کہانی ہے۔ بیٹا بیشتر ماں کے پہلو میں ہمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی منکوحہ کے لیے Non erotic اور Passive ہی رہتا ہے۔ اس کی بیوی شبانہ لے دے کر اس سے ایک بیٹا ہی پیدا کرتی ہے اور پندرہ سولہ سال اپنی ناآسودگی کی خلش کے ساتھ کاٹتی ہے۔“^(۶)

جمیل کاچو خیل نے اپنا ایک اور افسانوی مجموعہ ”جلتا سرا سلگتی روح“ کے عنوان سے پبلش کیا ہے۔ جس کا انتساب ”ان جوانوں کے نام جنہوں نے منشیات کے عفریت کو شکست دے کر نیا جنم لیا“ اس بات کی گواہی ہے کہ انہوں نے سماجی برائیوں کو نہ صرف گہرے مشاہدے سے اپنے قلم کی نوک پر رکھا ہے بلکہ اپنے قلم سے معاشرے میں تبدیلی کی کوشش بھی کی ہے۔ افغان جنگ کے ساتھ دو چیزوں نے پورے پاکستان اور بالخصوص خیبر پختونخوا کا سماجی ڈھانچہ تباہ کر دیا اور وہ دو چیزیں ”اسلحہ“ اور ”منشیات“ ہیں۔ افغان جنگ نے جہاں اس معاشرے میں جہاں جنگ، قتل و غارت، بم دھماکوں کو جنم دیا وہاں اس معاشرے میں منشیات کے استعمال اور منشیات کے کاروبار کو

خوبصورت حمد کے مصنف "اومحبت الہی" کے مصنف، بالآخر یسوع کا محض ایک جملہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشہور کہاوت ہے کہ جو کوئی بھی اس کی پیروی کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ "خود سے انکار کرے، اور اپنی صلیب اٹھائے اور میری پیروی کرے" (متی ۲۴.۱۶)۔

ہماری اور دیگر مذہبی روایات میں ان کی جڑیں خواہ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہوں، اس طرح کے تبصروں کے بارے میں کوئی خراب چیز تلاش کرنا آسان ہے۔ ان میں یہ دیکھنا آسان ہے کہ اس طرح کی ایک بے ہنگم موت کی پرستش جس کی فریڈرک نطشے عیسائیوں میں اس قدر شدید مذمت کرتے ہیں جیسے دانتے الیگھیری، "وہ ہانا جو قبروں پر شاعری کرتی ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ جو سمپوزیم میں Alcibiades کو پسند کرتے ہیں وہ سقراط کی جہالت کو ایک ناقابل فہم نفی کے طور پر دیکھتے ہیں، یا جو نطشے (اور پرسی شیلی اور تھامس ہارڈی) کی طرح مسیحیوں کی صلیب کی بلندی کو ایک بھیانک قتل کے خوفناک جشن کے طور پر دیکھتے ہیں، وہ مکمل طور پر نہیں ہیں۔ اس پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی اور کچھ کہنا باقی ہے۔ میں یہاں اس کے بارے میں تھوڑا سا کہنے کی امید کرتا ہوں۔ کچھ ملحدوں کی طرف سے ایک چیلنج یہ ہے: مسیحی موت سے بالکل کیوں ڈرتے ہیں، اگر واقعی جنت کی بھلائی وہی ہے جس کا وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس سے باہر ہے؟ چنانچہ حال ہی میں رچرڈ ڈاکنز دی گاڈ ڈیلیوژن میں دلیل دیتے ہیں۔ اگر مسیحی واقعی جنت کے اپنے نظریے پر یقین رکھتے ہیں، تو وہ موت سے نہیں ڈریں گے۔ لیکن وہ موت سے ڈرتے ہیں، اس لیے وہ واقعی اپنے آسمانی نظریے پر یقین نہیں رکھتے۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ موت کا خوف انسان کی تاریخ میں سب پرانا خوف ہے جس کو انسان آفرینش سے جھیل رہا ہے۔ اس خوف سے نجات کے لیے فلسفی، دانشور، شاعر، ادیب اور سائنسدان، سب نے اپنے اپنے نظریے پیش کیے ہیں مگر وہ انسان کو اس خوف سے نجات نہیں دلا سکے۔ یوسف عزیز زاہد خیبر پختونخوا معاصر نمائندہ افسانہ نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کے قلم نے خارج سے متاثر ہونے والے انسان کے باطن کا تجزیہ کیا ہے اور اسے سامنے لایا ہے کہ کس طرح خارج ہمارے باطن کو چاٹ جاتا ہے۔

یوسف عزیز زاہد بھی اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں جو جنگ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ یہ ایسا خطہ ہے جہاں کوئی بھی ایسا گھر موجود نہیں جس میں جنگ کی وجہ سے کوئی اپنوں سے دور نہ ہوا ہو۔ جس کی وجہ سے اس معاشرے میں جنگ کی وجہ سے موت کا خود پاکستان کے دیگر خطوں کی نسبت زیادہ اور بھیانک انداز میں موجود ہے۔ یوسف عزیز نے بھی اپنے گہرے مشاہدے سے اس خوف کو محسوس کیا پھر اپنے قلم کی طاقت سے بیان بھی کیا ہے۔ یوسف عزیز اپنی کتاب "لا یعنیت کی بھیڑ میں" کے ایک افسانے میں اسی خوف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”میرا شوہر اپنا چہرہ اور ہم اپنے ناخنوں سے کھرچتا رہتا تھا۔ پر ایک دن صبح اٹھ کر ہم نے دیکھا کہ اس کا سارا جسم مٹی میں بدل رہا ہے۔۔۔ بابو جی! آپ ہی بتائیں ایسے شخص کی موت کا ثبوت میں کہاں سے لاؤں جس کا جنازہ ہی نہ اٹھا ہو“ وہ رونے لگی۔“^(۸)

اس طرح یوسف عزیز کے ہاں موت اپنی پوری حقیقت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک صور حال ہے کہ اس خطے نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ہم نے چار بڑے آپریشن کیے اور درجنوں چھوٹے آپریشن کیے، کھربوں روپے خرچ کیے، ہزاروں لوگ بے گھر ہوئے، ہزاروں بے گناہ لوگ اس جنگ کا ایندھن بنے۔ آپریشن کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہر آپریشن کے بعد ایک ہی جملہ سننے کو ملا کہ ہم نے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی۔ دہشت گردوں کی کمر کس حد تک ٹوٹی ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اس ملک و قوم کی کمر واقعی ٹوٹ چکی ہے، خبر یہ ہے کہ ہم ایک اور آپریشن کی تیاری کر رہے ہیں، جبکہ سوال یہ ہے کہ پہلے چار آپریشن کیسے مختلف تھا؟ آئیے مل کر جواب تلاش کریں۔ سہولت کے لیے ہم پاکستانی فوج کے ان درجنوں آپریشنز کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس آپریشن کا پہلا مرحلہ ۱۱ ستمبر سے ۲۰۰۹ء تک ہے اور دوسرا مرحلہ ۲۰۰۹ء میں جی ایچ کیو پر حملے سے لے کر ۲۰۱۷ء میں آپریشن ریڈ کرپشن تک ہے۔

دہشت گردی کے خاتمے کے پہلے مرحلے میں، پاکستانی افواج نے ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۹ء تک کم از کم پانچ بڑے فوجی آپریشن کیے جن میں کئی چھوٹے آپریشنز شامل تھے: آپریشن اینڈورنگ فریڈم (۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۲ء)، آپریشن المیزان (۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۶ء)، آپریشن زلزلہ۔ (۱۳۸۷ء)، آپریشن شر ڈیل، صحیح راستہ اور صحیح راستہ (۱۳۸۶ء تا ۱۳۸۶ء)، اور آپریشن وے آف سالویشن (۱۳۸۸ء تا ۱۳۸۸ء)۔ ستمبر ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۹ء تک اس فوجی آپریشن کی وجہ سے پاکستان کو 45 ارب ڈالر کا نقصان پہنچا۔ جس کے منفی اثرات پوری معیشت پر براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کے نقصان، سرمائے کی کمی، آپریشنل علاقوں میں صنعتوں کے بند ہونے کی صورت میں پڑے اور نہ صرف مضبوط رہے بلکہ مزید مضبوط ہوئے۔ اسلام آباد انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹجک سٹڈیز کے مطابق اس عرصے کے دوران تقریباً ڈیڑھ لاکھ پاکستانی فوجی فاٹا اور کے پی کے کے علاقوں میں تعینات تھے۔^(۹)

اس طرح ایک اور جگہ یوسف عزیز لکھتے ہیں:

”بھی فرمائیے!“ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بنانا جملہ دہرایا۔ گھبرا کر اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی اور ہونٹوں پر دیمک زدہ خاموشی کنڈلی مارے بیٹھی نظر آئی۔ شاید کسی مرنے والے کا بہت قریبی عزیز ہے۔ میں

نے ایک لمحے کے لئے سوچا۔“^(۱۰)

حمزہ حسن شیخ ہر فن کے ماہر ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر کو ہر فن میں قائل کرنے کا فن جانتا ہے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے کہانی کار بھی ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ رولنگ جیمز شائع ہوا۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن امریکہ میں شائع ہوئے۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں پندرہ کہانیاں ہیں۔ ہر کہانی کا ایک الگ موضوع ہوتا ہے اور ہر کہانی اپنے اندر ایک اور کہانی تخلیق کرتی ہے۔ حمزہ حسن شیخ نے انگریزی اور اردو کہانیاں لکھی ہیں۔ ”کاغذ“ اور ”قیدی“ اردو کہانیوں کے دو مجموعے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کہانیاں تو سنائی نہیں دیتیں لیکن ہمارے معاشرے کی وہ زہریلی برائیاں جنہیں ہر کوئی نظر انداز کرتا ہے لیکن حمزہ حسن شیخ نے ان تمام برائیوں کو معاشرے کے سامنے لانے کی جسارت کی ہے۔

اس مضمون میں ۴۱ کہانیاں ہیں۔ حمزہ حسن کی پہلی کہانی ”دھند میں چھپا چاند“ ایک گورکھی کی حالت زار کو بیان کرتی ہے۔ اس افسانے میں ۲۰۰۵ء میں آنے والے زلزلے کا عکس بھی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی ”انشورنس“ میں حمزہ حسن نے بے روزگاری اور سخت حالات کی وجہ سے نوجوانوں کو درپیش مسائل کو اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ ”بولی“ کی کہانی کے مکالمے بہترین ہیں۔ اسی طرح ہر افسانے کی اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ”قیدی“ اپنی جگہ ایک الگ مقام رکھتا ہے، اس مجموعے میں سولہ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی کا الگ موضوع ہے۔ اس سیریز کی زیادہ تر کہانیاں دہشت گردی سے متعلق ہیں۔ اور کچھ کہانیاں بہترین ہیں۔ اس مجموعے کی تمام کہانیوں کا موضوع انسانی المیے کا اظہار ہے۔

حمزہ حسن شیخ اپنے افسانوی مجموعے ”قیدی“ میں لکھتے ہیں کہ:

”اس کتاب میں بھی کچھ قیدیوں کی کہانیاں ہیں۔ کچھ پیار و محبت کے قیدی تو کچھ دہشت و خوف کے قیدی، کچھ غربت کے قیدی تو کچھ خوابوں اور خواہشوں کے قیدی۔ زندگی بھی تو ایک قید ہی ہے اور ہر زندگی کا ایک قیدی ہے جس کی اپنی ایک کہانی ہے۔۔۔۔۔ کسی دریا کے پانی کی طرح رواں رہتی ہے یا کسی قید کی چکی کی طرح سست رو چلتی رہتی ہے جب تک وہ زندگی کی قید سے نجات نہیں پاتی۔ زندگی کی قید کے یہ مختلف رخ آپ کے سامنے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ قیدیوں کی یہ کہانیاں آپ کو اپنا اسیر بنا پاتی ہیں یا نہیں۔۔۔!!“^(۱)

حمزہ حسن شیخ نے اپنے قلم سے تلخ اور چبھتے ہوئے واقعات اس انداز میں لکھے ہیں کہ قاری خود کو ان حالات میں محسوس کرتا ہے۔ یہ اس کے قلم کی طاقت ہے۔ ایک ادیب کے لیے اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کی تحریر نہ صرف واقعات کو آگے پہنچا رہی ہو بلکہ اس سے جڑی کیفیات کو بھی قاری تک منتقل کر رہی ہوں۔ حمزہ

حسن شیخ کے اپنے معاصر افسانہ نگاروں کی نسبت جذبات، اظہار اور کیفیات کا الجھاؤ زیادہ ملتا ہے کیونکہ اس نے جیسا کہ اپنی کتاب میں بھی کہا ہے کہ میرے افسانے جنگ، دہشت گردی اور بم دھماکوں کے پس منظر میں لکھے گئے۔ ان افسانوں کا ایک ہی مقصد ہے اور یہ ہے کہ یہ افسانے اس کرب اس اذیت کو قاری تک پہنچائیں جس کرب اور اذیت سے جنگ زدہ علاقوں کے لوگ گزر رہے ہیں۔

حمزہ حسن شیخ کے افسانوں میں موت کے مناظر تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس علاقے میں بیس سال مسلسل روزانہ کی بنیادوں پر دھماکے ہو رہے ہیں۔ روزانہ بے گناہ لاشیں اٹھا رہے ہیں۔ لوگ گھر سے باہر نکلنے سے ڈرتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب خیبر پختونخوا کی عوام ایک ایسے دشمن کے قہر و غضب کا شکار بنے ہیں جو نظر نہیں آتا۔ ایک ایسا دشمن ہے جو آپ کے پہلو میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ عجیب طرح کا خوف ہے جو معاشرے کے ہر فرد پر طاری ہے۔ اپنے علاوہ تمام لوگ خود کش بمبار دکتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے شخص کے نزدیک موت کا پروانہ لیے کھڑا ہے۔ حمزہ حسن اس کتاب کے ایک افسانے ”قیدی“ میں لکھتے ہیں:

”دن بدن اموات کی تعداد میں اضافے سے ان کی زندگی مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ شہر کے حالات پر فکر مند تھے جہاں موت کے فرشتے کا راج تھا اور روزانہ ہی قبرستان میں لوگوں کا جم غفیر جمع ہوتا۔ ان کو اس ہجوم سے بھی خوف آتا تھا کیونکہ ان کے بہت سے ساتھی انسانوں کے بھاری قدموں تلے کچلے جاتے۔ اس لیے جب بھی وہ لوگوں کا ہجوم دیکھتے تو کہیں نہ کہیں چھپنے کی کوشش کرتے۔“ (۱۲)

یہ وہ کرب ہے جس کو خیبر پختونخوا کے ہر فرد نے جھیلا ہے۔ حمزہ حسن شیخ کی قوت مشاہدہ بہت طاقتور ہے۔ جیسا کہ وہ اس افسانے میں بھی یہی بات لکھ رہا ہے ان بم دھماکوں سے اموات کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو رہا ہے کہ یہاں زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں جس طرح انھوں نے شہر کے اندر موت کے مناظر کی پیش کش کی ہے وہ واقعی اردو افسانے میں منظر کشی کے حوالے سے ایک شاہکار ہے۔ کیونکہ مناظر کو ان کی پوری جذباتی جزئیات کے ساتھ پیش کرنا ہر افسانہ نگار کے بس میں نہیں ہوتا۔ ناول میں گو کہ ادیب کے پاس زیادہ وسیع کینوس ہوتا ہے اس لیے وہاں جزئیات نگاری کے ساتھ منظر کشی کرنا آسان رہتا ہے۔ جب کہ افسانہ نگار کے پاس یہ سہولت موجود نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے افسانہ نگار مناظر کی بجائے کہانی کے ساتھ چلتا ہے۔ مگر منظر نگاری اور کہانی میں توازن برقرار رکھتے ہوئے افسانے کے مقصد کو آگے پہنچانا واقعی ایک کمال ہے، جو ہر افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتا۔

حمزہ حسن شیخ کے ہاں دہشت گردی کے تناظر میں بڑھتی ہوئی اموات کے خوف کی جابجا عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کا ایک افسانہ ہے جس کا عنوان ”نوٹ بک“ ہے۔ اس افسانے میں لکھاری نے اس دہشت گردی اور قتل و غارت کے بچوں پر ہونے والے نفسیاتی نقصان کو بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک بچہ ہے جو سکول جاتا ہے، اس کے نزدیک تمام لوگ قابل احترام ہیں ہر چیز خوبصورت ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب اس کے تمام مناظر بدل جاتے ہیں۔ وہ دن اس کی زندگی کا بدترین دن ہوتا ہے جب کچھ دہشت گرد اس کے سکول میں گھس آتے ہیں اور فائرنگ کرتے ہوئے معصوم بچوں کو قتل کرتے ہیں۔ وہ اتنے سفاک درندے ہوتے ہیں کہ ان کو معصوم بچوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتی۔ اس قدر بے دریغ اور بے رحمی سے قتل کرتے ہیں کہ کلاس رومز خون سے بھر جاتے ہیں معصوم ننھی جانوں کا خون کلاس رومز کے دروازوں سے نکل کر کوریڈور تک بہنے لگتا ہے۔ اس افسانے میں حمزہ حسن اس خونی منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

”میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کلاس روم میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، یک لخت مشین گنوں کی گھن گرج گونجنے لگی اور ان کے منہ سے آگ برسنے لگی۔ کلاس میں ہر جانب سرخ رنگ پھیل گیا اور ساری دیواریں اور چھت سرخی رنگ کے دائرے سے اٹ گئیں۔ چیخ و پکار کانوں کو پھاڑنے لگی اور بچے ادھر ادھر دوڑنے لگے جبکہ میرے ادت نے اپنا سر مجھ پر رکھ دیا جیسے وہ کبھی کبھار گھر میں سوتا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کلاس میں اس طرح مجھ پر سویا تھا۔ سونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک تصویر بھی بنا رہا تھا جس کے رنگ تیزی سے میرے جسم پر پھیل رہے تھے۔ وہ پہلی بار وائر کلر شاہ کار بنا رہا تھا جو اس نے پہلے بھی نہ بنایا تھا اور سرخ رنگ نے میرے پورے جسم کو سجا دیا۔“^(۱۳)

یہ وہ افیت ناک مناظر ہیں جن کو حمزہ حسن شیخ نے اپنے افسانوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تمام باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ سوچیں کہ ان بچوں کی نفسیات کیا ہوگی؟ یہ بچے بڑے ہو کر زندگی کیسے گزاریں گے؟ تو نتائج کچھ خوفناک قسم کے سامنے آتے ہیں۔ اگر فرائیڈ کی باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان واقعات کا تجزیہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ ان بچوں پر تمام عمر موت کا خوف حاوی رہے گا یہ کبھی بھی اس خوف سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پائیں گے، ان بچوں کی اندر ایک ڈر انہیں زندگی میں کبھی آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ ایسے کتنے بچے ہوں گے جنہوں نے موت کے اس ننگے رقص کو اتنے قریب سے دیکھا ہو گا؟ حمزہ حسن نے اس افسانے میں دراصل پشاور میں واقع اے پی ایس پر ہونے والے حملہ کی طرف اشارہ کیا ہے، یا یوں کہیے اس

واقعہ کو بیان کیا ہے۔ یہ پاکستان میں دہشت گردی کی تاریخ کا سب سے بدترین اور مہلک حملہ تھا جس نے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس واقعے نے پوری قوم کو سو گوار کر دیا تھا۔ ہر طرف دکھ اور مایوسی کے گہرے بادل چھا گئے تھے۔

و۔ بے روزگاری کا خوف:

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ معیشت کی تباہی ہے۔ جہاں بھی جنگ شروع ہوگی وہاں سب سے پہلے معیشت تباہ ہوگی۔ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ نے بھی پاکستان کی معیشت تباہ کر دی تھی۔ اگر ہم خیبر پختونخوا کی سطح پر دیکھیں تو اس جنگ یہ خطہ فرنٹ لائن پر ہونے کی وجہ سے جنگ کے علاوہ معاشی حوالے سے بھی تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ کیونکہ ان حالات میں لوگ اپنی جان بچانے کو غنیمت سمجھتے ہیں وہ خرید و فروخت کیا کریں گے۔ دوسری وجہ کاروبار تباہ ہونے سے لوگوں کی قوتِ تخریب میں بھی کمی آتی ہے۔ بہر حال فنانس ڈویژن پاکستان کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۰ء تک پاکستان کو دہشت گردی کی وجہ سے ۱۱ بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔^(۱۴)

اس طرح سب سے زیادہ نقصان خیبر پختونخوا کی عوام کا ہوا ہے۔ جنہوں نے ہنستے ہنستے گھر بار چھوڑ کر ملک کے طول عرض میں ہجرت کی اور بے گھری کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ جنگ زدہ علاقوں میں لوگ اپنا کاروبار کیسے کرتے ہیں، ان کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔ ان حالات کو حمزہ حسن نے اپنے ایک افسانے میں یوں پیش کیا ہے:

”رفتہ رفتہ یہ ریڑھی والوں کے لیے خصوصی دن بن گیا اور وہ ہر اتوار کو اچھی فروخت کی اُمید سے پارک کا رخ کرتے چونکہ یہ شوبا قاعدگی سے منعقد ہوتا تھا، اس لیے ریڑھی والوں نے بھی وہاں ہر ہفتے جانے کا معمول بنالیا۔ ان میں سے ایک رحیمو بھی تھا جو میٹھی اور ٹھنڈی ٹھار قلفیاں بیچتا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھتا اور سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا پھر تا اور قلفیاں بیچ کر کچھ روپے کمالیتا۔ یہ اُس کا پیشہ تھا اور وہ جوانی سے یہ کام کر رہا تھا۔ وہ قلفیاں بیچنے سے تو اتنا نہیں کماتا تھا لیکن یہ اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی تھا۔“^(۱۵)

اس طرح حمزہ حسن کے بعد محمد جمیل کا چوخیل نے بھی اپنے افسانوی مجموعے ”نوحہ بے نام“ میں بھی بے شمار مرتبہ خیبر پختونخوا کی عوام کے روزگار کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ”نوحہ بے نام“ سوات کی نامعلوم حقیقت ہے، ایک ایسی سرزمین جس کی خوبصورتی، امن اور رواداری کی قدریں زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہیں، جو اسے گندھارا تہذیب کا مرکز بناتی ہے۔ خوشبوؤں کی تہذیب گندھارا نے اس وادی کو سجایا ہے اور یہاں کے لوگوں کو سائنس اور فن سے سجایا ہے۔ بعد میں، بدھ مت نے ان میں اہنس، سادگی کی روایت کو فروغ دیا۔ چوتھی صدی

عیسوی میں حسین کے تذکرے سے وادی کی خوبصورتی اور سکون کی آوازیں چین کے کونے کونے تک پہنچیں۔ پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنے والے فطرت سے جڑے ہوئے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ سوات کے ان باشندوں نے گندھارا تہذیب کے زیر اثر جو نقش و نگار اور مجسمے تیار کیے ہیں وہ ان کی نفاست اور جمالیاتی ذوق کو اسی نفاست اور لگن کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں جس طرح اس وادی میں بدھ وہار اور بدھ کے مجسمے ہیں، جس کی ایک ناممکن مثال ہے۔ یہ دراصل اس وادی کے باسیوں کی اندرونی خوبصورتی ہے، جو اپنے آپ کو مختلف طریقوں سے ظاہر کرتی ہے۔ یہ روایت نسل در نسل چلتی رہی۔ یہاں تک کہ یوسف زئی نے بھی اس خوبصورتی کو اپنے ذاتی خیال سے ہم آہنگ کیا۔

کیوں دور چلے جائیں، ۱۹ویں صدی میں افغانستان اور ہندوستان کی سرزمین عدم استحکام کا شکار تھی۔ اس وقت بھی ریاست سوات سید کبر شاہ کے زیر انتظام امن اور ہم آہنگی کا گہوارہ تھی اور ۱۹۶۹ء تک اپنی الگ ریاستی شناخت کے ساتھ رہی اور بعد میں پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ لیکن ۱۱ ستمبر کے بعد مذہب، پشتون تشخص اور قومی و بین الاقوامی طاقتوں کی مداخلت کی وجہ سے اس وادی کا امن و سکون تباہ ہو گیا۔ پشتون وادی، سماجی اقدار اور روایات دم توڑنے لگیں۔ تخلیقی صلاحیتیں اور سادگی دھوئیں میں اٹھ گئی۔

محمد جمیل کا چوخیل کانوحہ اس عام موت کانوحہ ہے جو انھوں نے لکھا تھا۔ معروضی حالات کے تناظر میں انتہا پسندی اور مذہبی و سماجی تنگ نظری کا افسانہ لکھا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں کے مجموعے میں پندرہ کہانیاں جمع کی ہیں جن میں اس کے ہوش سنبھالنے سے آج تک کے واقعات شامل ہیں جو ان کے مطابق سوات کی تاریخ کے بدترین سال ہیں، وہ وقت جب اس سرزمین کی روایات کو بری طرح مسخ کیا گیا تھا۔ اس وادی میں طالبان اور فوج کی مزاحمت کا نتیجہ سوات کے لوگوں کو بھگتنا پڑا۔ یہ مجموعہ ایک المیہ کی تصویر ہے جسے کہانی کار خود کہتا ہے کہ ایک عام شعر یا جگ کا ٹکڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سوات کی تعریف ہے جو کاچوخیل اپنے ہم وطنوں کو بتانا چاہتا ہے۔ جمیل کا چوخیل اس میں لکھتا ہے:

”چونکہ ہم لوگوں نے بھی اپنے گاؤں میں متاثرین کے لیے ایک ریلیف کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ اس لیے بہت دل دہلانے والے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور بہت کی آپ بیتیاں براہ راست متاثرین سے سماعت کرنے کو ملیں، لیکن جیسا کہ میں شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بعض کہانیاں ان کہی ہی اچھی رہتی ہیں۔ بعض دفعہ نہ جاننا جاننے سے اور جھوٹ کا پردہ، عیاں بیچ سے بہتر ہوتا ہے۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے مجھے لکھنے اور پھر اردو میں لکھنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ میں تمام اہل وطن کو سوات کا مرثیہ سنانا چاہتا ہوں۔ میں زیادہ سے

زیادہ لوگوں تک اپنا گریہ پہنچانا چاہتا ہوں۔“ (۱۰)

ز۔ تنہائی کا خوف:

قدیم زمانے سے لے کر ۲۱ ویں صدی تک، تنہائی ہمیشہ جنگ اور اس کے بعد کے تانے بانے میں بُنی جاتی رہی ہے۔ درحقیقت، فوج کے سابق اہلکار اور جنگ کے تجربہ کار، جنگجو کے الفاظ اوپر ہمارے وقت کے سابق فوجیوں کی تنہائی کی دنیا کی گواہی ہیں۔ اور پھر بھی، تنہائی سابق فوجیوں کی جنگ اور جنگ کے بعد کے تجربات کے سب سے کم تحقیق شدہ پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ درحقیقت، حال ہی میں تجربہ کاروں کی تنہائی کے لیے جنگ کے دیرپا اثرات کو مقداری طور پر تعین کرنے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں۔ حیرت کی بات نہیں، دونوں تحقیقات نے اشارہ کیا کہ بہت سے سابق فوجیوں کے لیے تنہائی ایک حقیقی مسئلہ بن سکتی ہے، یہاں تک کہ جنگ کے کئی دہائیوں بعد بھی۔ بہر حال، فوجیوں اور سابق فوجیوں کے تنہائی کے تجربات اکثر عام شہریوں کے تجربات سے مختلف ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس، اس باب کی رہنمائی اس تصور سے کی گئی ہے کہ تنہائی کے تجربات ہمیشہ سیاق و سباق سے منسلک ہوتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے ان کے رشتہ دار اجزاء کی بنیاد پر سمجھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر، تنہائی مختلف قسم کے رشتوں کے اندر ابھرتی ہے (مثال کے طور پر، مباشرت، ماتحت، اجتماعی، کامریڈ شپ، وغیرہ؛ مثال کے طور پر، Dykstra، ۱۹۹۳ء)، اور اس طرح مختلف رشتہ دار ضروریات اور دفعات کی تجربہ کار کمی سے وابستہ ہے (مثال کے طور پر، تعلق، تفہیم، سلامتی، وغیرہ)۔ اس طرح کے تغیرات بالآخر تجربہ شدہ تنہائی کے معیار کو تبدیل کر دیتے ہیں (مثال کے طور پر، جذباتی تنہائی، سماجی تنہائی، وجودی تنہائی، وغیرہ)، اور تنہائی جو اس کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ بہر حال جہاں تک جنگ کے بعد سویلین کی نفسیاتی مسائل کی بات ہے تو وہ بھی تنہائی کے خوف سے کبھی بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ حمزہ حسن شیخ اپنے ایک افسانہ "قیدی" میں تنہائی کی اس خوفناک صورت حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

”قیدی نے ڈائری بند کی اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے ہوا ہو چکی تھی۔ دھمکی آمیز الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور ان کے لبوں میں پر اعتمادی اور جذبے نے اس کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جیل میں لوگوں کے مختلف طبقات کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ سارے قیدی تھے لیکن ہر ایک کے ساتھ رویہ مختلف تھا۔ اس نے سلاخوں سے باہر نظر دوڑائی تو وہاں پر گہرا اندھیرا اور خاموشی تھی۔ لمبی راہداری میں گفتگو اور تہقہوں کا کچھ شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ سوچ کی وادی میں کھویا تھا اور دن بھر کی تفصیلی

گفتگو اس کے ذہن میں دوڑ رہی تھی۔ ایک قیدی دوسرے قیدی کو ذبح کرنے کی دھمکی کیسے دے سکتا ہے؟ یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی۔ رات کی گہری خاموشی کسی قیدی کے گانے اور سنتری کے راہداری میں ٹہلتے قدموں سے ٹوٹ رہی تھی۔ وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور جیل کے ماحول میں عجیب و غریب اُداسی محسوس کی۔“ (۱۷)

اس طرح محمد جمیل کا چوخیل کا ایک افسانہ ”میں کہاں جاؤں“ کے عنوان سے اس کی کتاب ”نوحہ بے نام“ میں موجود ہے جس کا مرکزی خیال اسی تنہائی کے دکھ کو لیے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں ایک لڑکی ہے جو جنگ کے دوران اس قدر ڈر گئی ہے کہ اب اسے خالی کمرے میں جانے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس کو اندھیرے میں لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ساتھ میں خون میں لت پت لاشیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس لیے گھر والے اس کو اکیلے بیٹھنے سے روکتے ہیں۔ ایک دن وہ چلاتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکل آتی ہے کہ اس کو پھر وہی جنگ کے مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کو پکارتی ہے اس کی ماں اس کو گلے لگا کر دلا سے دیتی ہے مگر اس کا خوف ختم نہیں ہوتا۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکی صومیہ جس کے والدین ایک دن پہلے طالبان کے حملے میں شہید ہو چکے ہیں۔ مگر جس وقت طالبان ان کے گھر پر حملہ کیا اس وقت صومیہ کی ماں نے صومیہ کو اپنے گھر کے ایک خفیہ کمرے میں دھکا دے کر بند کیا اور آگے سے کنڈی لگا دی۔ اس دوران اس کی والدہ کو گولیاں لگتی ہیں اور وہ مر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے والد پہلے ہی اس گھر کے دروازے پر شہید ہو چکے تھے۔ اس طرح اب صومیہ کے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا سوائے صومیہ کے۔ مگر صومیہ کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے والدین مر چکے ہیں۔ صومیہ کمرے میں بند ہے اور کمرہ باہر سے کنڈی سے بند ہے وہ باہر نہیں آسکتی، دن کو تو چلو کچھ روشنی تھی صومیہ کو سہارا رہا مگر جیسے ہی رات چھاتی ہے کمرے کا اندھیرا خوفناک ہوتا جاتا ہے جس میں صومیہ کو کئی طرح اوہام اور خیال آتے ہیں، صومیہ سارا دن زور زور سے چلا کر تھک چکی ہے اس کا گلاسارادن چلانے سے بند ہو چکا ہے اور اس کے ہاتھ میں چھالے پڑ چکے ہیں۔ اب یہاں سے صومیہ کی تنہائی شروع ہوتی ہے۔ صومیہ اس اندھیرے میں کئی طرح کے منظر دیکھتی ہے جو کہ غیر حقیقی ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن میں کئی خوفناک مناظر پیدا ہوتے ہیں۔ صومیہ بھوک اور تنہائی کے خوف سے اپنا ذہنی توازن تقریباً کھو چکی ہوتی ہے۔ بہت عرصہ بعد آرمی کا ایک ریسکیو آپریشن ہوتا ہے جس میں صومیہ کو ریسکیو کیا جاتا ہے بعد میں وہ ہسپتال کی زندگی گزارتی ہے۔ ان مناظر کو جمیل کا چوخیل نے یوں بیان کیا ہے:

”امی۔۔۔ ابو امی۔۔۔ امی۔۔۔ ابو۔۔۔ ایک ویران ٹوٹے پھوٹے گھر ہو۔۔۔ کے ایک بند کمرے سے یہ روہانسی آواز آرہی تھی۔ پھر دروازہ دھڑ دھڑانے لگتا۔ پھر امی ابو کی پکار پھر رونے کی آواز، مگر اس صدا کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ صرف اس گھر میں بلکہ سارے گاؤں میں بھی کوئی تھا بھی تو اتنی دور کہ اس تک یہ آواز نہیں پہنچ پارہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی چنگھاڑ تو

ہوں اور مارٹر گولوں کی گھن گرج میں اس نحیف آواز کو کون سن سکتا تھا جو مسلسل اس گاؤں پر گر رہے تھے۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ یہ دل خراش فریاد کسی بچی کی ہے۔ چیخنے چلانے سے بھی پانچ سالہ صومیہ کا کمزور گلا جواب دے گیا۔“ (۱۸)

اس طرح یوسف عزیز زاہد کے ہاں بھی اسی خوف کی کئی پر تیں ملتی ہیں۔ یوسف عزیز زاہد کا افسانوی مجموعہ ”روشن دان میں اندھیرا“ اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں جنگ کے بعد کے خوف اور تنہائی کو ایک الگ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یوسف عزیز زاہد ہم دھماکوں کے خوف، ٹارگٹ کلنگ کے خوف، اغوا کے خوف جہازوں کی آواز کے خوف، گولیوں کی آواز کے ڈر تمام خوف اور ڈر ایک علامتی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

ان کا ایک افسانہ ”جنگل“ ان تمام خوف اور ڈر کو اپنے اندر علامتی انداز میں سموئے ہوئے ہیں، اس میں لڑکے عادل کی کہانی ہے جو رات کو ایک گھنے جنگل میں سے گزرتے ہوئے اپنے گھر واپس آرہا ہے جس کو جنگ کی ہر چیز قاتل لگتی ہے اس کو جنگل کے تمام درخت خود کش بمبار دکھتے ہیں، تمام ٹہنیاں ایسے جیسے کوئی بندوق تانے کھڑا ہو، ہوا کی سرسراہٹ کسی گولی کی آواز کی طرح اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ وہ دبے پاؤں زور زور سے بھاگ رہا ہے اور ہانپ رہا ہے۔ حالانکہ یہ جنگل اس کے گھر کے قریب ہے جہاں سے دن میں کئی بار گزرتا ہے۔ اس کا سارا بچپن اسی جنگل میں کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔ اس کے بچپن کی تمام یادیں اس جنگل سے وابستہ ہیں مگر دہشت گردی کے اس عفریت نے اس کے بچپن کی سنہری یادوں کو خوفناک بنا دیا ہے اس کی تمام یادوں میں زہر گھول دیا ہے جس کی وجہ سے اب یہ جنگل جو ایک وقت میں اس کا دوست ہوا کرتا تھا اب اس کا دشمن بن کر سامنے کھڑا ہے۔ یوسف عزیز زاہد نے جس انداز میں اس سارے منظر کو بیان کیا ہے یہ واقعی قابلِ داد ہے۔ اسی افسانے میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

”بجلی کے کھمبوں اور تاروں پر، مسجد کے میناروں پر، درختوں کی شاخوں پر، سکول کی چھت پر، چرچ کی منڈیروں پر، مندر کے کلس پر، مکانوں کی مٹیوں پر، دکانوں کے چھجوں پر، سڑک راستے اور پگڈنڈیوں پر کووں، جیلوں اور گدھوں کے غول کے غول بیٹھے اپنے پروں کو نوچ رہے ہیں۔ راستوں میں اندھیرا تھک ہار کے سو گیا ہے۔ میلوں تک پھیلی ہوئی بھی، کالی غلیظ اور بدبودار سڑک ہے اور مجھے اس پل صراط کو عبور کر کے اپنے گھر تک رسائی حاصل کرنی ہے۔“ (۱۹)

ح۔ دہشت گردی کا خوف:

دہشت گردی کو اکثر سوچی سمجھی، نا انصافیوں کے لیے تشدد کی انتہائی شکل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ دہشت گردی کے بعد کے اثرات عام طور پر دہشت گردی کی کارروائی کے بنیادی نفسیاتی اور سماجی عوامل کو سمجھے بغیر رپورٹ کیے جاتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد سے پاکستان دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ دونوں کا مرکز رہا ہے۔ یہ خصوصی مقابلہ پاکستان میں دہشت گردی کے نفسیاتی تناظر کی وضاحت کرنے میں مدد کرتا ہے جو پر تشدد بنیاد پرستی کی طرف جاتا ہے۔ یہ پاکستان کی تاریخ، موجودہ جغرافیائی سیاسی اور سماجی منظر نامے کے پس منظر میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ نتائج اس بنیادی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک رہنما کے طور پر بھی کام کر سکتے ہیں۔

زیادہ تر قومیں 'دہشت گردی' کی قانونی طور پر پابند تعریف پر اتفاق رائے تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ یہ اصطلاح جذباتی طور پر چارج لگتی ہے اور اس طرح، حکومتیں اپنی تعریفیں وضع کرتی رہی ہیں۔ اب تک اقوام متحدہ دہشت گردی کی بین الاقوامی سطح پر متفقہ تعریف وضع کرنے سے قاصر ہے۔ دہشت گردی کو 'سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ڈرانے یا خوف کا استعمال کہا جاتا ہے۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد سے، مسلم ممالک خاص طور پر دہشت گردی کے لفظ سے جذباتی طور پر خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اسے نام نہاد مسلم انتہا پسند گروہوں کی طرف سے کی جانے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کے مترادف سمجھتے ہیں۔ میڈیا میں اس طرح کے خوفناک دہشت گردانہ حملوں کو اسلامی جہاد سے جوڑنے سے اس کی مزید تکمیل ہوتی ہے۔ دہشت گردی نے جنوبی ایشیائی ممالک کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور جسمانی انفراسٹرکچر پر منفی اثرات کے ذریعے بہت زیادہ بوجھ ڈالا ہے۔ پاکستان کو خاص طور پر دہشت گردی کی وجہ سے سماجی، معاشی اور انسانی قیمتوں سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی جنگ میں فرنٹ لائن پر پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی اسے غلط طور پر بین الاقوامی دہشت گردی کا سرپرست قرار دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی ایک ہمہ جہتی رجحان ہے اور اس کو جنم دینے والے بہت سے عوامل میں سے نفسیاتی عوامل ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مقالے میں اس بات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمارے خیال میں پاکستان میں دہشت گردی کے لیے اہم نفسیاتی عوامل ہیں۔ دہشت گردانہ سرگرمیاں انجام دینے کا عمل کسی ایک لمحے کے الہام سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ادراک کے ایک پیچیدہ عمل سے ہوتا ہے اور جمع ہونے والے قدموں پر انضمام ہوتا ہے۔ دہشت گردوں کو پاگل یا سائیکوپیتھ کا لیبل لگانا غلط طور پر تخفیف پسند ہے۔ دہشت گردوں کے محرکات میں ذاتی معنی اور اہمیت کی گہری،

بنیادی جستجو شامل ہو سکتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس طرح کے محرکات کے کئی تجزیے سامنے آئے ہیں۔ ان تجزیوں میں دہشت گردی کے لیے اہم کے طور پر شناخت کیے جانے والے محرک عوامل کی قسم اور مختلف قسم کے حوالے سے اختلافات ہیں۔ کچھ مصنفین نے ایک واحد محرک کو اہم قرار دیا۔ دوسروں نے محرکات کا ایک 'کاک ٹیل' درج کیا۔ سیاسی چیلنجوں کے ساتھ مل کر سماجی و اقتصادی مشکلات کا اوسط پاکستانی عوام کی نفسیات پر نقصان دہ اثر پڑے گا۔ ایک دہشت گرد اپنے متاثرین کی شناخت کے لیے ایک متضاد طریقہ اختیار کرتا ہے، سیاہ اور سفید خیال کہ 'میں اچھا ہوں' اور 'تم برے ہو'، جس میں کوئی درمیانی رنگ بھوری رنگ نہیں ہے۔ یہ سوچ ان کے ذہنوں میں کوئی شک نہیں چھوڑتی اور وہ اپنے مخالفین کو کم یا بغیر کسی پچھتاوے یا جرم کے احساس کے ساتھ مارنا آسان سمجھتے ہیں۔

بغیر پائلٹ کے ڈرون حملوں نے پاکستان کے غریب علاقوں میں ہزاروں بے گناہ شہریوں کو ہلاک اور معذور کر دیا۔ اس نے لوگوں کو مشتعل کیا، جس کی وجہ سے وہ سمجھے جانے والے حملہ آوروں کے خلاف ہتھیار اٹھانے لگے۔ مرنے والوں کے لواحقین کا اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہونا پاکستان میں انتقام کا کلچر ہے، جو بد قسمتی سے نسلوں تک قائم رہ سکتا ہے۔ خود قربانی اور شہادت کو تقریباً تمام مذاہب میں واضح طور پر استعمال کیا گیا ہے اور دہشت گرد تنظیموں کے ذریعے اس کا جارحانہ طور پر استحصال کیا جاتا ہے جو اسلامی شہادت کے نظریے کو استعمال کرتے ہوئے خود کش بمبار تیار کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ خود کش بمبار درحقیقت طبی طور پر خود کشی کر سکتے ہیں اور ذاتی تعطل سے بچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ نوجوان متاثر کن نوجوانوں کو تیار کرنے میں، انتہا پسند تنظیمیں ان نوجوانوں کو یہ یقین دلانے کے لیے برین واش کرتی ہیں کہ خود کش بم دھماکے کے ذریعے ان کی حتمی قربانی خدا کی نظر میں ان کے قد کو بلند کرے گی اور انہیں سیدھے جنت میں بھیج دے گی۔ اس کا تعلق متوفی کے خاندان کو بڑے پیمانے پر مالی معاوضے سے ہے۔

پاکستان میں دہشت گرد تنظیمیں، برین واشنگ کے اس عمل کے ذریعے، نوجوان متاثر کن مسلم نوجوانوں کو چھ ہفتوں میں 'خود کش بمبار' میں تبدیل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ کے موجودہ منظر نامے میں نوجوان نوجوانوں کو خود کش بمباروں کے طور پر بھرتی کرنے کا یہ پیچیدہ عمل ناقابل واپسی لگتا ہے۔ خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے بھی اس مسئلے کو اپنے افسانوں میں بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ یوسف عزیز زاہد ایک افسانے میں اس حادثے کو یوں پیش کرتے ہیں:

”تماشا۔۔۔ یار تماشا۔۔۔ لوگ بس تماشا دیکھنے کے شوقین ہیں۔ نہیں یار۔۔۔ تمھاری تو

سوچ ہی منفی ہے۔۔۔ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے حادثے تو روز ہوتے ہیں اور ہر حادثے

کے بعد ایک نیا تماشا۔۔۔ کب تک ہم یہ تماشا دیکھیں گے۔۔۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے۔۔۔ کوئی

راستہ تلاش کرو راستہ۔۔۔۔۔ ہاں اب کوئی راستہ تلاش کرنا ہی ہو گا۔۔۔۔۔ شام گہری ہونے لگی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ بجوم کو ہڑپ کر رہا ہے۔ تو پھر آؤ۔۔۔۔۔ ہم اپنے گھر کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ یہ اندھیرا تو ہم کو بھی نگل جائے گا۔“ (۲۰)

یہ تماشادہ تماشا ہے ان کے شہر میں روز موت کو پیش کرتا ہے۔ ایک ایسی موت جس کا بچنے والا ہمیشہ پردے کے پیچھے رہا ہے۔ اس ملک میں بس لاشیں ہیں، چالیس سال یہ لوگ لاشیں اٹھا رہے ہیں۔ مگر اب لوگ تھک چکے ہیں، اب ان کی نفسیات پر کسی دھماکے کسی موت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ روز روز کی موت نے انہیں بے حس بنا دیا ہے اب ان کے لیے موت ایک واقعہ ہے جو تھوڑی سے وقفے کے بعد پھر رونما ہو گا اور اس شدت سے رونما ہو گا کہ یہ لوگ پہلے والا موت کا تماشا بھول جائیں گے۔ یہ بڑی عجیب صورت حال ہے جس میں لوگ کسی کی موت پر رنجیدہ نہیں بلکہ اکتا چکے ہیں یہ عجیب جنگ ہے جس نے لوگوں کے ذہن شل کر دیے ہیں۔ اب ان کے لیے موت کے اس تماشے کا نہ ہونا حیرت کا باعث بنتا ہے۔ ان حالات میں ہم نے ایک اور چیز بھی نوٹ کی ہے کہ لوگ اس روز روز کی جنگ سے تنگ آ کر اپنے گھر بار، کاروبار، رشتے دار، زمین جائیداد سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور کہیں دور جانا چاہتے ہیں جہاں یہ تماشا نہ ہو جہاں ان کی جان محفوظ رہے جہاں وہ اپنے بچوں کو باہر بھیج کر ان کی واپسی کے دعائیں نہ مانگ رہے ہوں جہاں ان کے پیاروں کو کوئی بے وجہ قتل نہ کرے جہاں وہ جی سکیں۔ یہ تمام لوگ ایک ایسی دنیا میں جانے کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑنے پر تیار بیٹھے ہیں۔ اس طرح یوسف عزیز زاہد کے علاوہ محمد جمیل کا چوخیل کے ہاں بھی یہ منظر کثرت سے ملتے ہیں ان کے ہاں جس طرح کا معاشرہ افسانے میں دکھایا گیا ہے اس پر بھی یہی دہشت گری کا خوف طاری ہے۔ اس معاشرے کے ہر فرد پر یک انجان مصیبت کا خوف ہر وقت مسلط ہے۔ یہاں کے لوگ بھی دہشت گردی کے خوف سے اپنے گھروں سے باہر نکلنا بھول چکے ہیں۔ ان کے بازار ویران ہو گئے ہیں، ان کی گلیاں سنسان ہیں، ان کے کھیت ویران پڑے ہیں۔

محمد جمیل کا چوخیل اپنے ایک افسانے ”ماں“ میں اس منظر کو یوں پیش کرتے ہیں:

”کئی روز سے علاقے کی فضا پر ایک بے نام سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیر و بے رونق تھا اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ انسان تو انسا پر بھی کھیر تا کو اثر تھا۔ پرندے جیسے چہچہانا بھول گئے تھے۔ گاؤں کے کتے بھی کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ نہ تو بکریوں کی منمنناہٹ اور نہ مویشیوں کے گلے میں پڑی گھتئیوں کی آواز میں کیونکہ ان کی حرکت بھی قدرتی طور پرست پر گئی تھی۔ جیسے انہیں بھی خطرے کا احساس ہوا ہو۔“ (۲۱)

اس طرح حمزہ حسن شیخ کے ہاں بھی دہشت گردی خوف سے بھرا ہوا سماج پیش ہوا ہے جہاں صبح سے لے کر شام تک بم دھماکوں کی آوازیں ہیں۔ حمزہ حسن شیخ کے ہاں یہ مناظر زیادہ کثرت اور زیادہ شدت سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں جس طرح موت کے مناظر کو مکمل جزئیات میں بیان کیا گیا ہے اسی طرح دہشت گردی کے خوف کو بھی ہر چیز کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ان کے گھر سے لے کر بازار تک، کھیتوں سے لے کر جنگ تک، فرد سے لے کر معاشرے تک، تمام اکائیوں پر ایک خوف طاری ہے اور یہ خوف دہشت گردی کا خوف ہے۔

”بہت ہی عجیب و غریب جنگل تھا جس میں سب جانوروں کی شناخت کو دبا کر چار سو سانپوں کی اکثریت اور حکمرانی تھی۔ یہاں پر مختلف رنگوں کے سانپ تھے جن میں، نیلے، سرخ، سیاہ و سفید، پہلے، چتکبرے، دھاری دار رنگ کے سانپ تھے اگرچہ اس جنگل میں تمام اقسام کے جانور زندگی گزار رہے تھے لیکن روز بروز سانپوں کی حاکمیت بڑھتی چلی گئی۔ شروعات میں، یہاں صرف و صرف مظلوم بھیڑیں اور باقی کچھ جانور رہتے تھے، اگرچہ یہاں پر سانپ بھی تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ بہت خطرناک حد تک زہریلے تھے۔“ (۲۲)

i۔ ممتا کی موت:

اس کہانی میں ممتا کی بے لوث محبت اور جذبے کی شدت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ نہ صرف بے مثال ہے بلکہ مصنف نے رشتوں کی صداقت کو اجاگر کر کے سچائی کے حسن کو اجاگر کیا ہے۔ مزید یہ کہ کہانی میں ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ ممتا کی کیفیت کو فنکارانہ قربت اور دردناک ردِ عمل سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ قابلِ تعریف ہے۔ جسے بجا طور پر مصنف کی مشاہداتی اور تخلیقی ذہانت کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ زندگی اور گرد و نواح میں بے زبان مخلوق کے درد کو محسوس کرنا اور اسے زبان دینا ایک ایسے فنکار کا کام ہے جس کے سینے میں ایک حقیقی انسان کا دل ہے اور وہ انسانیت کے آداب کو جانتا ہے۔ بلاشبہ علامتوں اور حقیقت کا استعاراتی امتزاج یہ کہانی انسانی جذبات اور سماجی رشتوں کو تہذیب کے میدان میں داخل ہونے اور معاشرے کے فطری قوانین کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف نے ایک آئینہ دار کہانی بیان کی ہے جس میں ہمیں ہر جگہ اپنا چہرہ نظر آتا ہے اور ہماری بات، عمل اور سوچ کے عمل کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ یہ ایک انتہائی علامتی کہانی ہے، لیکن یہ زندگی کی حقیقتوں کو فنی کمال کے ساتھ افسانوی رومانیت کی صورت میں پیش کرتی ہے، اس طرح لاشعور کو شعور کی سطح پر لاتی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے ماحول کے تناظر میں منعکس کیا جاسکے۔

”وہ بھی برسات کی ایک حسین صبح تھی۔ زندگی معمول کے مطابق جاری تھی لیکن پل پل پر بدلنے میں برسات کسی محبوب سے کم نہیں۔ ایک کلو میٹر اُدھر آسمان صاف ہو گا تو ایک کلو میٹر اُدھر جل تھل ہو گی۔ کبھی یہ بارش کسی ظالم دیو کی طرح گھن گرج کے ساتھ آتی ہے۔ تو کبھی کسی دلنواز حسینہ کی طرح ٹھنڈی مدھم پھوار بنتی ہے۔“ (۲۳)

ان کے سامنے ان کی شکل و صورت اور عالمی تناظر میں ان کے قد و قامت کی حقیقت دکھائی جاتی ہے لیکن ایسے زاویے سے اس خطے کے لوگوں اور ان کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو گونگا ہونے اور بینائی سے محروم ہونے کے باوجود بولتا ہے، جب کہ اس میں قوت سماعت نہیں ہے، اس نے الفاظ کی تشریح میں حواس اور ضمیر اور خمیر کے کھوجانے کا اظہار کیا ہے۔ درحقیقت یہ حکمران طبقات اور ہمارے حکمرانوں کی سیاسی بے ایمانی کا آئینہ دار ہے۔ عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خارجہ پالیسی، داخلی امور میں سامراج کی غلامی میں اس ملک اور اس کے عوام کی تقدیر کی تاریکیاں اور محرومیاں ہر باضمیر اور باشعور شہری کو قابل فخر ہیں۔ ملک کے سیاسی منظر نامے میں اپنا قومی کردار ادا کرنے کی ترغیب دے کر انہیں چگاڈروں کے جذبے اور حساسیت سے باہر نکل کر اندھیروں سے روشنی کی طرف سفر کرنے کی اطلاع دی جاتی ہے وہ آج بھی بے بس محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ہمیں ندامت کا احساس تک نہیں ہے اور چگاڈر رات کے اندھیرے میں اپنے وجود سے واقف ہیں اور روزمرہ کی زندگی کے رسم و رواج جانتے ہیں اور ہم جو بہترین مخلوق ہیں اس کے قابل۔ ہم اندھیرے میں دیکھتے ہیں اور دن کی روشنی میں اس قدر کھوجاتے ہیں کہ خود کو پہچان بھی نہیں پاتے۔ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا آج کے حالات میں بلبے باز بننا زیادہ بہتر اور مفید نہیں؟ میں اُلُو کو بطور مثال استعمال نہیں کروں گا کیونکہ یہ بہت ذہین اور بالغ مخلوق ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ گرے، جے، خوف اور تناؤ کی نفسیات، نیویارک، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۷ء، ص ۳۴
- ۲۔ آئن سٹائن، البرٹ، مذہب اور سائنس، مترجم: خالد سہیل، مضمون ”انسانی شعور کا ارتقا“ کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱
- ۳۔ محمد جمیل کاچوخیل، ہم خاک نشیں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۲ء، ص ۱۱
- ۴۔ ایضاً، ص ۲۴
- ۵۔ ایضاً، ص ۷۷
- ۶۔ شہناز شورو، زوال دکھ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۵
- ۷۔ محمد جمیل کاچوخیل، جلتا سرا سلگتی روح، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰
- ۸۔ یوسف عزیز زاہد، لایعنیت کی بھیڑ میں، القمر انٹرپرائزز، ۱۹۹۶ء، ص ۶۵
- ۹۔ <https://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/casualties.htm>
- ۱۰۔ یوسف عزیز زاہد، لایعنیت کی بھیڑ میں، ص ۶۳
- ۱۱۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، فلشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۱۰
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱
- ۱۴۔ https://www.finance.gov.pk/survey/chapter_11/Special%20Section_1.pdf
- ۱۵۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، فلشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۵۹
- ۱۶۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶
- ۱۷۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، فلشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء، ص ۲۸
- ۱۸۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، ص ۸۹
- ۱۹۔ یوسف عزیز زاہد، روشندان میں اندھیرا، ملاقات پبلی کیشنز، پشاور، ص ۴۵
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۷۵
- ۲۱۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، مثال پبلشرز، ص ۹۶
- ۲۲۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، فلشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء، ص ۱۰۳
- ۲۳۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، ص ۳۸

باب سوم :

خیبر پختونخوا کے منتخب معاصر ادو افسانے میں دہشت کے عناصر

دہشت گردی، ایک عالمی چیلنج کے طور پر، لوگوں میں دہشت، خوف اور افراتفری پھیلانے کے لیے ایسی کارروائیوں کو استعمال کرتی ہے۔ دہشت گردوں کی امید یہ ہے کہ پیدا ہونے والا خوف عوام کو سیاسی رہنماؤں پر بعض اقدامات کے لیے دباؤ ڈالے گا [۲]۔ میڈیا دہشت گردی کے بارے میں تصورات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اکثر اس کے اثرات کو بڑھاتا ہے۔ دہشت گردانہ کارروائیوں کا مقصد خوف کو بھڑکانا ہے، جو اسے ایک طاقتور نفسیاتی آلہ بناتا ہے۔ "دہشت گردی کے خلاف جنگ" دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے دہشت گردی کے استعمال پر زور دیتے ہوئے، دھمکی کے پہلو کو واضح کرتی ہے۔

دہشت گردی کی نفسیاتی جہت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مطالعہ دہشت گردی کے خوف اور COVID-19 جیسے صحت سے متعلق خطرات کا موازنہ کرتے ہوئے نامعلوم کے خوف کو دریافت کرتا ہے۔ امتحان سے نمٹنے کی حکمت عملیوں اور لچک کے ساتھ وابستگیوں کا پتہ چلتا ہے، جو خوف اور سماجی رد عمل کے درمیان پیچیدہ تعامل پر روشنی ڈالتا ہے [۴]۔ مزید برآں، پاکستان جیسے مخصوص خطوں میں دہشت گردی کے نفسیاتی تناظر کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق پر تشدد بنیاد پرستی کا باعث بننے والے عوامل پر روشنی ڈالتی ہے، جو مختلف سماجی و ثقافتی سیاق و سباق میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی بنیادی وجوہات کی بصیرت فراہم کرتی ہے۔

بشریاتی نقطہ نظر دہشت گردی کے تصورات کی تشکیل میں میڈیا کے کردار کو نمایاں کرتا ہے۔ دہشت گردی کے خوف کو ممکنہ خطرے کے منظر ناموں کے تناظر میں پرکھا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دہشت گردی کے حملے میں مارے جانے کا اصل خطرہ تصور سے کم ہو سکتا ہے، خوف کو بڑھانے میں میڈیا کے کردار پر زور دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ میڈیا کی حرکیات اور نفسیاتی طریقہ کار سے چلنے والی دہشت گردی کے معاشرے، سیاست اور عالمی سلامتی پر دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان پیچیدگیوں کو سمجھنا دہشت گردی کے اثرات سے نمٹنے اور کم کرنے کے لیے موثر حکمت عملی وضع کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

اثرات کا تجزیہ ایک منظم انداز ہے جو کسی مجوزہ تبدیلی یا عمل کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے نتائج کا اندازہ لگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کاروبار، پروجیکٹ مینجمنٹ اور فیصلہ سازی سمیت مختلف شعبوں میں ایک اہم عمل ہے۔ یہ طریقہ افراد یا تنظیموں کو ممکنہ نتائج کا اندازہ لگانے اور مضمرات کی جامع تفہیم کی بنیاد پر باخبر

فیصلے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ فراہم کردہ تلاش کے نتائج کے تناظر میں، اثرات کے تجزیہ کے تصور کو متعدد ذرائع میں چھوا ہے۔ مائنڈ ٹولز کا مضمون کسی تبدیلی پر غور کرتے وقت منفی اثرات یا نتائج کی نشاندہی کرنے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ یہ کسی فیصلے یا عمل کے ممکنہ اثرات کا اچھی طرح سے تجزیہ کرنے کے لیے ایک منظم طریقہ فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح، ماسٹر کلاس تین قسم کے اثرات کے تجزیہ کے طریقوں پر غور کرتا ہے۔ یہ طریقے کسی خاص فیصلے یا تبدیلی سے وابستہ ممکنہ مثبت اور منفی نتائج کا جائزہ لینے میں مدد کرتے ہیں۔ ان اثرات کو سمجھنا اچھی طرح سے باخبر اور اسٹریٹجک انتخاب کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اثرات کا تجزیہ نہ صرف کاروبار اور پراجیکٹ مینجمنٹ میں بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بھی ایک قابل قدر ٹول ہے۔ چاہے کسی مجوزہ پالیسی، منصوبے، یا ذاتی فیصلے کے نتائج کا اندازہ لگانا ہو، یہ تجزیاتی نقطہ نظر ممکنہ اثرات کا ایک جامع نظریہ فراہم کر کے فیصلہ سازی کو بڑھاتا ہے۔ جنگ اور دہشت گردی کے ہمہ جہتی رجحان کو مختلف زاویوں سے پرکھنے سے ان پیچیدہ مسائل سے وابستہ پیچیدہ حرکیات اور نتائج سامنے آتے ہیں۔

الف۔ مالیاتی اور حکمت عملی کی تفاوت:

دہشت گرد گروہ، جیسا کہ کونسل آف یورپ کے دستور میں روشنی ڈالی گئی ہے، اکثر ریاستوں کے مالی اور پیشہ ورانہ وسائل کی کمی کا شکار ہوتے ہیں۔ پھر بھی، ان کا اثر مادی صلاحیتوں سے آگے بڑھتا ہے، غیر متناسب جنگ میں غیر روایتی حربوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

i۔ نفسیاتی جہت:

دہشت گردی کے نفسیاتی تناظر میں، خاص طور پر پاکستان میں، ان عوامل پر روشنی ڈالتا ہے جو پر تشدد بنیاد پرستی کا باعث بنتے ہیں۔ نفسیاتی سیاق و سباق کو سمجھنا ان بنیادی وجوہات، محرکات اور معاشرتی حرکیات کے بارے میں بصیرت فراہم کرتا ہے جو دہشت گردی کی کارروائیوں کو برقرار رکھنے میں معاون ہیں۔

ii۔ انٹر گروپ ڈائنامکس:

دہشت گردی کے بارے میں بین گروپ کا نقطہ نظر دہشت گردی کی تعریف کے موضوعی نوعیت کو چیلنج کرتا ہے۔ جسے کوئی دہشت گردی سمجھتا ہے اسے دوسرے کی طرف سے آزادی کی جدوجہد کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ رشتہ داری عالمی سطح پر دہشت گردی کی تشریح اور اس سے نمٹنے کی پیچیدگی کو واضح کرتی ہے۔

iii- میڈیا اور دھمکی کی تعمیر:

دہشت گردی کے خطرے کی تعمیر میں میڈیا کے کردار کا تجزیہ اس بات کی بصیرت فراہم کرتا ہے کہ بیانیے کس طرح عوامی تاثرات کو تشکیل دیتے ہیں۔ میڈیا کی تصویر کشی دہشت گردی سے وابستہ خوف اور نفسیاتی اثرات میں اہم کردار ادا کرتی ہے، سماجی رویوں اور رد عمل کو متاثر کرتی ہے۔

iv- عالمی سفارت کاری اور انسداد دہشت گردی کی کوششیں:

دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے درکار بین الاقوامی تعاون کو اجاگر کرتی ہے۔ سفارتی کوششیں، اثاثے منجمد کرنا، اور مالی امداد دہشت گرد نیٹ ورکس کے اثر و رسوخ اور سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ایک مربوط عالمی رد عمل کو ظاہر کرتی ہے۔ ان تناظرات پر غور کرنے سے جنگ اور دہشت گردی سے متعلق پیچیدگیوں کے بارے میں ہماری سمجھ میں اضافہ ہوتا ہے، جو ان مظاہر کی وجہ سے درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ایک زیادہ جامع نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ دہشت گرد گروہ، جیسا کہ کونسل آف یورپ کے دستور العمل میں بیان کیا گیا ہے، ریاستوں کے مقابلے میں محدود پیشہ ورانہ اور مالی وسائل کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ تاہم، یہ نقطہ نظر اس بات پر زور دیتا ہے کہ دہشت گردی کا اثر روایتی جنگ سے آگے بڑھتا ہے، جو ان گروہوں کے ذریعے استعمال کیے جانے والے غیر روایتی حربوں اور غیر متناسب جنگی حکمت عملیوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا نقطہ نظر بین الاقوامی تعاون کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی سطح پر ۱۹۶ ممالک دہشت گردی کے خلاف مالی جنگ کی حمایت کرتے ہیں، دہشت گردی کی سرگرمیوں کے خلاف متحدہ محاذ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سفارتی کوششوں، اثاثوں کو منجمد کرنے، اور عالمی ہم آہنگی کو دہشت گرد نیٹ ورکس کے اثر و رسوخ اور سرگرمیوں سے نمٹنے کے لیے ضروری ہتھیاروں کے طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر پاکستان میں پر تشدد بنیاد پرستی کا باعث بننے والے عوامل کا پتہ لگاتا ہے۔

اس نقطہ نظر کا مقصد نفسیاتی سیاق و سباق کو سمجھنا ہے، بشمول معاشرتی حرکیات اور محرکات، جو دہشت گردی کی کارروائیوں کو جاری رکھنے میں معاون ہیں۔ یہ ان بنیادی وجوہات کی نشاندہی کرتا ہے جو افراد کو انتہا پسندانہ نظریات اور پر تشدد کارروائیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ دہشت گردی کی تعریف مختلف ہوتی ہے، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ سیاسی مقصد کے بغیر انفرادی کارروائیوں کو دہشت گردی نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ نقطہ نظر اس تصور کو متعارف کراتا ہے کہ نیٹ ورک کا سائز دہشت گردی کی کارروائیوں کی کامیابی کی کلید ہے، اس طرح کی سرگرمیوں کی باہم مربوط اور منظم نوعیت کو اجاگر کرتا ہے۔ دہشت گردی کے خطرے کی تشکیل میں میڈیا کے

کردار کا جائزہ دہشت گردی پر رپورٹنگ کے اثرات پر مرکوز ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محرکات کو تلاش کیے بغیر خود واقعات پر توجہ مرکوز کرنا عوام کی سمجھ کو محدود کر سکتا ہے۔ دہشت گردی کے بارے میں تاثرات اور رد عمل کی تشکیل میں میڈیا کا اثر اس تناظر کا ایک اہم پہلو ہے۔ ثقافتی تناظر دہشت گردوں کی سماجی نفسیات کی کھوج کرتا ہے، عصری معاشرے میں خوف کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔ یہ خوف کی ثقافت سے جڑی اقدار کی کھوج کرتا ہے، اس بات کا تجزیہ کرتا ہے کہ جدید دہشت گردی کس طرح سماجی طور پر پیدا ہوتی ہے اور اس کے نفسیاتی اثرات ہوتے ہیں۔

ب۔ بم دھماکے:

اگر ہم دہشت گردی کی واردات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اس میں سب سے پہلے بم دھماکے آتے ہیں۔ یہ بم دھماکے کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سب سے زیادہ خطرناک ریموٹ کنٹرول بم دھماکے اور خود کش بم دھماکے ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں دہشت گردی کا جائزہ لیں تو اس میں یہ دونوں ذرائع بے انتہا استعمال ہوئے ہیں۔ ریموٹ کنٹرول بم دھماکوں کی نسبت خود کش بم دھماکے زیادہ مہلک اور دہشت زدہ ہوتے ہیں۔

حزہ حسن کا ایک افسانہ ”کٹے پھٹے دھڑکا مکالمہ“ انہی بم دھماکوں کی کہانی سناتا ہے۔ وہ لکھتا ہے دھماکہ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے ہر چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ دھواں صاف ہونے میں کافی وقت لگا اور دائرہ چھ ہو گیا، لیکن برسوں پر انارشتہ واپس آگیا۔ ایک اس کا ابدی رشتہ ہے۔ لیکن ایک نازک اور نازک دھماگے کی طرح جسے صرف ایک سانس روک کر توڑا جاسکتا ہے۔ کئی سالوں تک وہ ایک چہرے پر دو مختلف شکلوں میں لیکن ایک ہی نام کے ساتھ رہا۔ ان کی دوستی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ الگ ہو جاتے ہیں اور پکار دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔ وہ گہرے دوست تھے، سکھوں نے ایک ساتھ تمام دکھ برداشت کیے، لیکن جب ان کا رشتہ ختم ہوا تو وہ ایک دوسرے کے دکھ اور خوشی سے محروم ہو گئے۔ یہ صدیوں تک چلتا رہا اور کئی بار ان کا رشتہ ٹوٹ گیا لیکن وہ ہر روز کوئی وعدہ کرتے اور کبھی ایک دن، ہفتے، مہینے یا چند سالوں میں توڑ دیتے۔ ان کا رشتہ ہمیشہ خطرے میں رہا لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر ان میں سے ایک اداس تھا، تو دوسرا اسے محسوس کرنا یقینی تھا۔ یہ ان کی ایک ساتھ زندگی تھی۔ دھماکہ ان کے تعلقات کے خاتمے کی خبر بھی لے کر آیا اور اب وہ دوبارہ کبھی دوستی نہ کرنے کے لیے الگ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک ہوا میں کھو گیا تھا جبکہ دوسرا ٹکڑوں میں زمین پر گر گیا تھا اور ناقابل شناخت تھا۔ لوگ اسے نام دینے کے لیے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”وہ زخمیوں کو ہسپتال لے کر جا رہے تھے اور جن کی شناخت ہو چکی تھی، ان کو ایمبولینس میں ڈال دیا گیا لیکن وہ بغیر کسی شناخت کے سڑک کی ایک جانب پڑا تھا۔ وہ اپنے بکھرے ٹکڑوں پر چیخ اور کراہ رہا تھا لیکن کسی نے بھی اُس کی چیخ و پکار پر کان نہ دھرے۔ ہر طرف افرا تفری

وہ اسے ہسپتال لے گئے اور مردہ خانے میں ڈال دیا کیونکہ وہ اپنی شناخت کھو چکا تھا۔ وہ اپنے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سارا دن مردہ خانے میں پڑا رہا۔ رات گئے مردہ خانے کا دروازہ کھلا اور اس کے کچھ رشتہ دار اندر داخل ہوئے۔ اس نے سب کو پہچان لیا لیکن انھوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اس کے گرد چکر لگائے لیکن گھبراہٹ ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ ان میں سے ایک نے اس کی جیبیں تلاش کیں لیکن ان میں کچھ نہیں تھا کیونکہ سب کچھ اڑا دیا گیا تھا۔ ان کے چہروں پر مایوسی دیکھی جاسکتی تھی۔ تب ایک بزرگ رشتہ دار اس کے قریب آیا اور اس کا ایک خون آلود بازو چادر سے نکال کر غور سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد، اسے اس کے بازو پر چھرا اگھونپنے کا زخم ملتا ہے جب وہ بچپن میں تھا۔ وہ چیتا اور پھر اس کے گرد جمع ہوئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خوش تھا لیکن کافی دیر تک مردہ خانہ آہوں اور گریہ وزاری سے بھر رہا اور سب کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ اسے گھر لے گئے اور اس کے جسم کے کچھ ٹکڑے درختوں، سڑک اور فٹ پاتھ پر چھوڑ گئے جبکہ اس کے جسم کے کچھ حصوں کو اسٹرپچر پر رکھا گیا۔ ایک بار پھر گھر میں عذاب چھا گیا۔ عورتیں اس کے جسم کو گھورتی رہیں، حالانکہ وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھیں۔ اس کی آنکھوں میں گھبراہٹ اور خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ بے قراری کے عالم میں روتا رہا اور ایک بار پھر اس نے آخری تقریب سے پہلے اس کی لاش کا بندوبست کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس کے جسم کے ٹکڑے لے کر اس کے جسم سے جوڑنے کی کوشش کی۔ چچا! تم کیا کر رہے ہو؟ یہ ٹانگ کا وہ حصہ ہے جو تم نے میرے سینے پر رکھا ہے۔ لیکن اس کے کہنے کی کیا اہمیت تھی اور اس کے جسم نے بھی اس گوشت کو ماننے سے انکار کر دیا اور نیچے کھسک گئے۔ چچا نے حیرت سے اسے دیکھا اور اس کے جسم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر دوبارہ جوڑوں کو محسوس کیا۔ اس نے گوشت کا ٹکڑا اس کی ٹانگ پر رکھا جسے اس نے قبول کیا اور پچھڑے کی طرح گلے لگا لیا۔ حمزہ حسن کا یہ افسانہ، دھماکے والے لمحے کی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بم دھماکے کے فوراً بعد مناظر کتنے دلدوز ہوتے ہیں اور ان مناظر میں اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے بچ جانے والے زخمیوں کو اٹھانا کتنا دل گردے کا کام ہے۔ اس طرح اگر ہم محمد جمیل کا چوخیل کے ہاں دیکھیں تو وہاں بھی بم دھماکوں کے بعد کے مناظر اور اس دوران لوگ کس کرب سے گزرتے ہیں جیسے مناظر تقریباً ہر افسانے میں ملتے ہیں۔ جمیل کا چوخیل کے ہاں یہ مناظر اس شدت سے بیان ہیں ہوئے جس طرح ان مناظر کو ہم نے حمزہ حسن شیخ کے ہاں دیکھے ہیں۔ اس فرق کی بنیادی وجہ دونوں کے اسلوب میں فرق کا ہے۔ حمزہ حسن شیخ کے ہاں مناظر شدید اور جزئیات میں پیش ہوئے ہیں جبکہ جمیل کا چوخیل کے ہاں مناظر کی بجائے جذبات کی ترسیل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بہر حال دونوں افسانہ نگار اپنی جگہ اپنی ڈومین میں درست اور ماہر ہیں۔

جمیل کا چوخیل اپنے ایک افسانے ”نوحہ بے نام“ میں ایک بم دھماکے کے منظر کو یوں پیش کرتے ہیں:

”حملہ آور نے دروازہ اڑتے دیکھا تو وہ بھاگ کر کمرے میں چلا گیا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ میجر اگرچاہتا تو وہیں سے اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر وہ اپنے عزم کا پکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے ہوئے جوانوں کو صحن میں رکھنے کا حکم دیا اور خود برآمدے میں کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے خیال میں اب بھی وہ اپنی گفتگو سے اُسے رام کر سکتا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسے باہر آنے کے لیے مجبور کرنے لگا۔ جب کہ وہ بارہا اسے اس کے حال پر چھوڑنے کے لیے کہہ رہا تھا کہ اچانک مہیب دھماکہ ہوا۔ ہر طرف گرد و غبار کی چادر سی تن گئی۔“ (۳)

اس افسانے میں ایک میجر کی کہانی ہے۔ یہ آرمی کا ایک میجر ہوتا ہے جو ایک انجان نمبر پر کسی لڑکی سے کافی عرصہ سے بات کر رہا ہوتا ہے۔ میجر اس لڑکی کو جنگ کے سارے حالات بتاتا ہے۔ روز سے کسی کے مرنے کی خبر دیتا ہے روزانہ اسے یہ بتاتا ہے کہ آج ہمارے اوپر فلاں جگہ حملہ ہوا ہے جس پر لڑکی مسکرا کر کہتی ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوتا، تم نہیں مرتے، دونوں مسکراتے ہیں۔ پھر ایک دن میجر اس لڑکی سے بات کر رہا ہے کہ اور اسے اپنے میس کی کہانی اور رات کے کھانے کے بارے میں بتا رہا ہوتا ہے کہ اتنے میں اس میجر کی بیرک میں فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میجر لڑکی سے بات کرتے ہوئے اپنے کمرے کی ونڈو سے باہر دیکھتا ہے تو چھاؤنی میں ہر طرف آگ لگ چکی ہے اور چھاؤنی پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا تھا اتنے میں میجر کو اس کا سپاہی آکر بتاتا ہے کہ سر ہم پر حملہ ہو گیا ابھی وہ سپاہی اپنی بات مکمل نہیں کرتا کہ ایک گولی کا نشانہ بن کر ڈھیر ہو جاتا ہے اس کے بعد میجر فون بند کیے بغیر نیچے پھینکتا ہے اور آہنی بندوق اٹھا کر اپنے کمرے کا دروازہ جیسے ہی کھولتا ہے تو باہر ایک خودکش بمبار اس کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے جو میجر کو دیکھتے ہیں اللہ ہو اکبر کا نعرہ لگاتا ہے اور دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتا ہے، ساتھ میں میجر کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کہانی میں بھی وہی موت کا خوف اور دہشت گردی کا ڈر بیان ہوا ہے جس نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس کے بعد اگر یوسف عزیز زاہد کے ہاں خودکش دھماکوں کے حوالے سے افسانے دیکھیں تو ان کے ہاں بھی کثرت سے ان مناظر پر افسانے ملتے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعہ ”روشن دان میں اندھیرا“ اس حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل مجموعہ ہے جس میں ایک افسانہ ”دھول“ کے نام سے موجد ہے۔ جس میں ایک خاتون ہے جس کے ہاتھ میں دودھ پیتا بچہ ہے۔ ذرا اس منظر کو ملاحظہ فرمائیں:

”بازار کی بھیڑ میں اس کی مخصوص ہو مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہوئی تو میں متلاشی نظروں سے گزرتے ہوئے چہروں کو ٹھٹھولنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس بھیڑ میں موجود ہے۔ شام کا جھپٹا تھا۔ دوکانوں کی روشنیاں، نیون سائن اور اسٹریٹ لائٹس آن ہو رہی تھیں۔ بھیڑ سے نکل کر میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں شاپنگ سنٹر سے نکل کر وہ مال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آواز دے کر میں اسے روکنا ہی چاہتا تھا کہ یاد آیا اس کے نام سے تو میں آشنا ہی نہیں ہوں۔“ (۴)

i۔ پگلی:

پگلی مصنف کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے، بلکہ مصنف نے ایک واقعہ حقیقت کی کہانی سنا کر اسے محفوظ کرنے کا فریضہ پورا کیا ہے اور ایک لحاظ سے وادی سوات کی حالیہ تاریخ کا ایک باب رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوگلی زمینائی اس کہانی میں پختون ثقافتی اور سماجی زندگی کا زندہ کردار ہے جو پختون خواتین کی سماجی حیثیت، محبت اور شادی شدہ زندگی کی خصوصیات اور پسماندہ رسم و رواج اور محدود معاشرتی حدود میں منجمد خیالات و تصورات پر مشتمل ہے۔ قدامت پسند روایات نئی نسل کی پیچیدگیوں، نوجوان جذبات اور آدھے باغی اور آدھے بیدار احتجاجی رویوں کے ہنگامہ خیز جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کہانی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں سوات دھڑے کہلانے والے دہشت گردوں کے ہاتھوں لوگوں کو مارنے کی غیر انسانی کارروائیوں کو دکھایا گیا ہے اور فوجی آپریشن بھی کہانی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ جو بذات خود مصنف کی ایمانداری اور جرأت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور ساتھ ہی وادی ارام کی تباہی و بربادی اور بے گناہوں کے قتل عام کا نمونہ اور ادب میں مذہبی حقیقت پسندی کا انداز بھی ہے۔

لہذا پختون معاشرے میں تربرولی (قبیلوں کے درمیان دشمنی) کی جھوٹی روایت کئی سو سال پرانی ہے، اس لیے روایتی طور پر ایک خاندان کا خون اور انتہائی قریبی رشتہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا رہا ہے۔ ٹوٹا ہوا بازو آج بھی اسی رشتے کی آخری کڑی ہے لیکن حالات و حادثات کی قوت نے اپنے وجود کی گردن بنا کر خون کے نئے رشتے کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑ دیا ہے۔ اس خاندان کی دشمنی اپنی جگہ۔ لیکن طالبان کے اچانک نمودار ہونے سے بہار کا پورا خطہ بدبودار گرٹھا اور انسانی گوشت اور خون کی ندیاں بن گیا جہاں مردار کھانے والے گدھ اور بھیڑیوں نے بھی کھانے کے لیے منہ چھپا رکھا تھا۔ حیوانیت اور ظلم سے، بھوک کی فطری نفسیات اور اپنی وحشیانہ روایات کو بھول کر وہ اپنی شرافت کا اندازہ لگانے لگے کہ انسان بھی اس قدر پست ہو سکتا ہے کہ جانوروں سے بھی بڑھ کر حیوانیت کو جنون کی حد تک دکھانے کے لیے شیطانی رقص کا اہتمام کرے۔ ایک ایسی کہانی جس میں حالات کے جبر

کو بے نقاب کیا گیا ہے، پختون ثقافت اور اعلیٰ انسانی اقدار کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ عام انسانی نفسیات اور جادوئی رشتوں کے میدان میں مصنف نے اس انتظامی اعزاز کے بارے میں لکھا ہے جو افراد، خاندانوں اور قبیلوں کی لامتناہی صدیوں کے تنازعات اور دشمنیوں کے دوران ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا ہے اور اس مسئلے کو کھول دیا ہے۔

”وہ دونوں پھر بھوک سے بے تاب تھے۔ وہ ہر لاش کے پاس آتے۔ اس کو سونگھتے اور واپس چلے جاتے۔ بھلا وہ ایک انسان کو کیسے کھا سکتے تھے۔ کیونکہ قدرت نے کتوں کی فطرت میں انسان کی محبت اور وفاداری بھر دی ہے، مگر چند دنوں بعد لاشیں پھول گئیں ان سے بدبو کے پھلکے اٹھنے لگے۔ ان کی انسانی شکلیں مسخ ہو گئیں۔ تو پہلے گیدڑوں اور پھر آوارہ کتوں نے انہیں کھانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں بھی دوسرے کتوں کے ساتھ شامل ہوئے لگے اور اس طرح مردہ خور بن گئے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔“ (۵)

یہ کہانی اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں سوات کی حالیہ تباہی اور طالبان کے مذہب کے نام پر پختونوں کے گھروں پر یلغار کے وحشیانہ اور غیر انسانی اقدامات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ معصوم بچوں کے بہیمانہ قتل کو دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے اور مصنف اس سے بے خوف ہے۔ نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں اور غیر ملکی امیروں کے ایجنٹوں کا ایجنڈا، ایک قابل فخر پختون، ایک ایماندار اور انصاف پسند مصنف کے طور پر، اس دور کے المناک منظر نامے میں کہانی کا مرکزی خیال بناتا ہے۔ اور سفاکانہ تاریخ نہ صرف تاریخ کو محفوظ رکھتی ہے بلکہ سوات کے لوگوں کے دکھوں کا تعارف کرتی ہے اور مصائب اور قربانیوں کو اسی طرح کا نام دیتی ہے۔ آنے والی نسلوں کے لیے قابل فخر اور قابل تقلید رول ماڈل، سوات کے بیٹوں اور بیٹیوں کی بہادری، صبر، استقامت اور ہمت پوری دنیا کے لیے ایک شاندار رول ماڈل ہے اور نئی ۲۱ ویں صدی میں لوگوں نے منفرد کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ یہ کہانی انسانی عزم، ہمت اور بہادری کی لازوال داستان کے طور پر جانی جائے گی۔ خاص طور پر پختون خواتین نے اپنے پیاروں سے جدائی کے دکھ کے باوجود اپنی جان کی پروا نہ کی اور کلومیٹر دور پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں اور جنگلوں میں بھوکی، پیاسی، زخمی بھاگی لیکن اس نے اپنے آباؤ اجداد کی چادر اور پگڑی کو زمین پر نہیں گرنے دیا اور یہ پختون معاشرے کی روایات، پختون خواتین کی نفسیات، پختون ثقافت اور پختونولی کے معیار کی بنیادیں ہیں۔ مصنف نے کہانی میں خلوص نیت کے ساتھ خوبصورتی کو یکجا کر کے پختونخوا کی ثقافتی تاریخ کو بدنامی اور بے نامی سے بچایا ہے۔

مصنف نے ان کہانیوں کے کرداروں کی نفسیات اور حرکات و سکنات کو خاص طور پر اس کہانی میں بڑی ایمانداری سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح سوات کی سرزمین کے قدرتی حسن اور خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ کرداروں کی شخصیت اور سماجی عمل کو بھی انھوں نے تحریر میں اپنی آہنی مٹھی دکھائی ہے۔ خاص طور پر کہانی کی مرکزی کردار پلو شہ کی خوبصورتی کے بیان میں تو شاعر بھی پیچھے رہ گئے ہیں لیکن قدرت کے احسانات کو جس طرح وہ پہنتی ہے اس نے مجھے بہت مسحور کر دیا۔ اس کے علاوہ، "پلو شہ کے کردار اور اعمال کی خوبصورتی، عادات کی مناسب اور متناسب ڈرائنگ اور دماغ اور دل کی ہم آہنگی، اور جس حد تک اس نے اپنے بچپن میں اپنی محبت، عزم اور ثابت قدمی کا اظہار کیا اور جوانی کا سفر یہ لاجواب ہو گیا ہے۔

ج۔ خود کش حملے:

اس خطے کے لوگ سب سے زیادہ خود کش حملوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ دہشت گرد اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کے ذریعے خوف کو جوڑتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ دہشت گردوں کو شہری یا غیر جنگی اہداف کے خلاف بلا سوچے سمجھے تشدد کرنے کی ترغیب دیتی ہے اس رجحان کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے۔ 'بنیادی وجوہات' کی موجودہ بحث اکثر انفرادی سطح پر ایک جنونی دہشت گرد کے ذہن میں تہذیب کے خلاف مخالفت کے اسباب تلاش کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ تاہم، اس بحث میں کہ ایک دہشت گرد کو کیا ترغیب دیتی ہے، تاہم، ان عوامل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو دہشت گرد کو دہشت گردانہ سرگرمیاں کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ جیسا کہ والٹر لیکور نے استدلال کیا، یہاں تک کہ اگر دہشت گردی کے لیے انتہا پسندی کے محرکات پر بہتر کنٹرول حاصل کیا جاسکتا ہے، تب بھی کچھ الگ تھلگ افراد ہوں گے جن کے لیے دہشت گردی کے لیے کام کرنے کا لالچ۔ اگر موقع باقی رہا تو۔ مزاحمت کرنا مشکل ہو گا۔ دہشت گردوں کی تعداد کو کم کرنے کے لیے بنیادی وجوہات سے نمٹنا ضروری ہے، دہشت گردوں کی کارروائی کرنے کی صلاحیت کو کم کرنے کے لیے ان عوامل کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔

یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ دہشت گردی کے پیچھے محرکات کو کم کرنا ایک نسل یا اس سے زیادہ کا کام ہے، اور ان کی صلاحیت کو کم کرنا اس دوران مسلسل توجہ کا متقاضی ہو گا۔ بنیادی وجوہات کو نظر انداز کیے بغیر، یہ پالیسی سپر دہشت گردی کی کارروائی کے محرک اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے درمیان تعلق (یا تعلق کی دوسری شکل) کو توڑنے میں ریاست کے کردار کی کھوج کرتا ہے۔ پاکستان میں، ایک ایسی ریاست جہاں مذہب اپنے لوگوں کی واحد اجتماعی شناخت فراہم کرتا ہے۔۔۔ ریاست کے وجود سے بڑھ کر۔۔۔ مذہب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ایک اہم

سیاسی سرگرمی ہے۔ سرد جنگ کے ابتدائی مشرق و مغرب کے تناظر میں، قوم کے لوگوں کی مذہبیت اور اس کی سیاست میں مذہبی عنصر نے ملک کی لبرل وفاداری کو محفوظ بنانے کی بنیاد کے طور پر بین الاقوامی دلچسپی اور حمایت کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ 'اسلامیت' بعد میں پوری دنیا کے لیے تشویش کا باعث اور حتمی خطرہ بن گئی ہے: لیکن پاکستان کو بطور ریاست مل چکی ہے اور اب بھی اس حقیقت سے خود کو ہم آہنگ کرنا مشکل ہے۔ یہ پالیسی پیپر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آیا پاکستان اب ہے، اور خود کو (صحیح یا غلط) عالمی برادری کا ایک حصہ سمجھتا ہے جو مذہبی انتہاپسند دہشت گردی سے خوفزدہ ہے۔ یوسف عزیز زاهد نے اپنے ایک افسانے میں ان خود کش دھماکوں کے خوف کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”تو میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے عادل۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے کی کوشش کرتا ہوں تو دل کا پتلا ہے کہ کوئی امیر زادہ اپنی نئی کار سے پھل کر نہ گزر جائے کوئی بے قابو ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ کر میری ہڈیوں کا سرمہ نہ بنا دے۔ اب تم ہی بتاؤ عادل، میں آفس کیسے آؤں گا؟ کوئی سواری، کوئی راستہ محفوظ ہی نہیں رہا۔“^(۶)

اب یہاں بھی عادل کو ایک ایسا خوف لاحق ہے جس کی وجہ سے وہ کہیں جانے سے ڈرتا ہے۔ اس کو شہر کی گلیاں، گھر کے خالی کمرے، ویران راستے، کھیت، دفتر کے خالی کوریڈور، ہر چیز میں ایک انجان سا خوف ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کے کاموں پر پوری توجہ نہیں کر پارہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک زندگی کی دوڑ میں ٹھیک طرح بھاگ نہیں سکتا جب تک وہ ذہنی طور پر آسودہ نہ ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس خطے کے لوگوں میں ایک ڈر ہے جو انہیں آگے بڑھنے سے روکتا ہے ان کے ہاں زندگی کے کوئی معنی نہیں رہے وہ اپنے مقصد میں کہیں پیچھے کھڑے ہیں۔ ان کے نزدیک اس قیامت خیز دہشت گردی کے دنوں میں خود کو زندہ رکھنا ہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اگر ہم اس وقت کسی بھی گھر کا جائزہ لیں جہاں کسی خود کش دھماکے کی وجہ سے ان کے کسی عزیز کی جان چلی گئی ہو، تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اس گھر کے تمام افراد سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے ہوں گے کیونکہ ان لوگوں نے دہشت گردی کی وجہ سے موت کو انتہائی قریب سے دیکھا ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں ایک ڈر ہے جو گھر کر گیا ہے اب ان کے ہاں زندگی ایک نازک ترین اور ناپائیدار چیز ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ان علاقوں کے لوگوں میں قانون اور ریاست سے اعتبار ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ ریاست یا قانون کی پہلی ذمہ داری ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی جان

کی حفاظت کرے، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس علاقے میں ریاست اپنے بنیادی فریضہ ادا کرنے میں ناکام رہی ہے جس کی وجہ سے ان خطے کے لوگوں میں اپنی ریاست سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔

اس طرح حمزہ حسن نے بھی اپنے افسانوں میں ان واقعات کو بڑی جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حمزہ حسن کا ایک افسانہ ”منڈی“ کے عنوان سے موجد ہے جس میں وہ انسانی گوشت کی منڈی کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ لاشیں، لاشیں لے لو۔ سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے لاشوں کو فروخت کرنے کے لیے اونچی آواز میں لپیٹ دیا گیا، اور لوگ لاشوں کی نئی کھپ کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے جہاں وہ تھیں۔ اس قبیلے میں مختلف لاشیں، پوری لاشیں، آدھی لاشیں، صاف ستھری لاشیں اور خون آلود لاشیں تھیں۔ اور۔۔۔۔۔ کفن پوش لاشیں، بے کفن لاشیں اور یہاں تک کہ تنگ جسم۔ مزید گولیوں سے چھلنی لاشیں، بکھری ہوئی لاشیں، ماتھے میں ایک گولی لگی لاشیں، سینے میں گولی لگی لاشیں یا آنکھیں، ناخن، سر، پاؤں، بازو اور ہاتھ کے بغیر لاشیں۔ یہ لاشیں، بچوں، عورتوں اور مردوں کی لاشیں لے لو۔ فروخت کے لیے لاشیں، بوڑھے اور جوان۔ ایک بار پھر آواز نے لوگوں کی توجہ کا مطالبہ کیا۔ قابل شناخت لاشوں کی قدریں مختلف تھیں کیونکہ ان کے پیارے انہیں لے جانے کے لیے تیار تھے، جب کہ بہت سی لاشیں ناقابل شناخت تھیں، اس لیے ان کے ساتھ کوئی قیمت منسلک نہیں تھی اور کوئی انہیں لینے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کچرے کے برابر تھے لیکن پھر بھی لاشوں کے ڈیلر لاشیں بیچنے کے شوقین تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ان لاشوں کو دیکھو!!! ہر مذہب کا جسم۔ شیعوں کی لاشیں، ہندوؤں کی لاشیں، عیسائیوں کی لاشیں لاؤ! آوازیں بلند سے بلند ہوتی گئیں اور مردوں کے اس بازار نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کیونکہ دنیا کے اس تاریک کونے میں جسم کا سب سے بڑا بازار بنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان لاشوں کو ٹرکوں سے نکالا جا رہا ہے، لاشوں کو کاروں سے نکالا جا رہا ہے، لاشیں جانوروں کی پیٹھوں سے پٹی ہوئی ہے۔ یا ان لاشوں کو دیکھو جو کیلوں سے چھید ہیں۔ ہتھوڑے سے کچلی ہوئی لاشیں۔ یا ان لاشوں کو دیکھنے آؤ۔ تری ہوئی لاشیں!!! وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آواز بلند ہوتی گئی۔ چلو بھی!!! ان اداروں کی تجویز دو یکساں باڈیز ہیں۔ وردی کے بغیر جسم۔ رنگ برنگے کپڑوں کے ساتھ جسم۔ سادہ کپڑوں میں لاشوں کو دیکھو یا یہ ننگے جسموں کو؟ ہاں... آؤ ان برہنہ لاشوں کو لے آؤ، وہاں بہت رش تھا اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہر قسم کے تاجر اور گاہک اپنی مرضی کی لاش ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہ اسے اپنے آبائی قبرستان میں دفن کر سکیں۔ گاہکوں کے ساتھ ساتھ تماشائیوں کا بھی ہجوم تھا جو دل فریب نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ان گاہکوں کی حالت زار پر مسکرا رہے تھے جو اپنی پسند کا عزیز ترین جسم ڈھونڈ رہے

تھے۔ بولی لگانے والے بہت بے چین اور پر جوش دکھائی دے رہے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ نئے سامان کے بازار میں آنے سے پہلے ان تمام لاشوں کو فروخت کرنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ ان کا حجم بڑھنے لگا جب کہ ان کی قیمت گرنے لگی: ان لاشوں کو دیکھو۔۔۔!!! کفن شدہ لاشیں، بغیر کفن لاشیں، تابوتوں میں لاشیں، چادروں میں لاشیں یا پیکجوں میں لاشیں۔ اس نے اپنی آواز بلند کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف بلایا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ آؤ دیکھو یہ لاشیں، جھنڈوں والی لاشیں، جھنڈوں کے بغیر لاشیں، تمنگوں والی لاشیں لے لو۔

”آؤ ان لاشوں کو دیکھو۔۔۔ اچھلے ہوئے پلاسٹک سے بھی لائیں۔۔۔ بجلی کے کرنٹ سے مرنے والوں کی لائیں۔۔۔ بارش میں گھر کی چھت گرنے سے مرنے والوں کی لائی!!! آؤ۔۔۔ یہ لے جاؤ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ یہاں دیکھو۔۔۔!! تازہ لائیں، دل کے بغیر، گردوں، آنکھوں، ناک اور دوسرے اعضاء کے بغیر۔۔۔ ابھی آواز میں بلند ہو رہی تھیں کہ نیامال مارکیٹ میں لایا گیا۔ مارکیٹ میں تازہ مال رکھنے کی اب مزید گنجائش نہیں رہی تھی تو ایک بار پھر آوازوں نے مارکیٹ پر قبضہ جمالیا۔ ان پرانی لاشوں کو باہر رکھو۔۔۔!! انی لاشوں کو سجاؤ۔۔۔!!! نیامال اندر رکھو۔۔۔!“ (۷)

رضا کاروں کے درمیان مسابقت کا ماحول تھا اور کوئی بھی اپنی آواز کو پست کرنے کو تیار نہیں تھا۔ چلو بھئی! ان لاشوں کو دیکھو، وہ لاشیں جو تیزاب سے دھو دی گئی ہیں۔ مکمل طور پر ناقابل شناخت۔۔۔ چلو!!! بغیر کسی الزام کے یا پتہ لگانے کے خوف کے۔ ان کو پکڑو۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ انہیں بہت سستی قیمت پر حاصل کریں۔ وہ بہت بلند آواز میں تھے اور زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے چیخ رہے تھے۔ لاشوں کے اس ڈھیر کو دیکھو، غربت میں پڑی لاشیں۔ کھانے کے بغیر لاشیں، بھوک سے مرنے والوں کی لاشیں۔ پانی کی کمی کے باعث مرنے والوں کی لاشیں۔ جسم و ٹامنز سے بالکل خالی ہے۔ کوئی نمک نہیں، وٹامن نہیں، کیسٹرول سے پاک۔ یقیناً یہ لاشیں وقت کے ساتھ ساتھ آپ کے لیے بہت موہک ہوں گی، ان کی آوازیں جذبے اور جذبات سے بھری ہوتی جائیں گی۔ اب وہ بولی کے لیے اس بازار میں لانے کے لیے ہر جاندار کو لاش میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ کیا آواز اتنی پرکشش تھی کہ بازار کے ہر کونے میں لوگوں تک نہیں پہنچ پاتی؟ یہاں آؤ یہاں آؤ جلی ہوئی لاشوں کو دیکھو، وہ فیکٹریوں میں جلائی گئیں۔ فسادات میں جل گئے۔ دھماکے سے گھروں کے چولہے جل گئے۔ گلیوں میں جلتے رہے۔ لاشوں نے سرکاری ہیڈ کوارٹر کے سامنے خود سوزی کی۔ آؤ انہیں دیکھو!!! وہ بہت پرکشش ہیں۔ ان کی

کوئی شناخت نہیں ہے۔ بلکل کالا، بلکل کالے کوئے کی طرح!!! آؤ ایک نظر رنگ برنگے کوئے لوگوں پر!!! اس کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ان مکمل طور پر جلی ہوئی لاشوں کو غور سے دیکھیں۔ یہ کفن زدہ اور ننگا ہے۔ ان پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ آؤ اور انہیں خریدو، بولی لگتی رہی اور جیسے ہی کوئی نیا گائک بازار میں داخل ہوا، سب نے اسے منانے کے لیے آوازیں بلند کیں۔ ہر کوئی اپنی ہولڈنگ بیچنے کے لیے بے تاب نظر آیا تاکہ مارکیٹ میں نئی جائیدادیں آسکیں۔ انہیں لے لو ان لاشوں کو دیکھو۔ ان کو سنگسار کر کے لاؤ۔ انکو دیکھو انہیں آدھا زمین میں دفن لاؤ۔ انہیں اینٹوں، لٹھیوں اور لوہے کی سلاخوں سے مارا گیا۔ چلو لو گو غور سے دیکھو۔ اپنی لائنس کو گرم لوہے کے ساتھ لاؤ۔ لاؤ ان کو داغ دار کھلے لوہے کے ساتھ، آؤ ان لاشوں کو دیکھو، لاؤ بجلی کے جھلسنے والے مردہ، لاؤ لاؤ گرتی چھت کی بارش سے! گردے، آنکھ، ناک اور جسم کے دیگر اعضاء کے بغیر آوازیں اٹھیں کہ نئی دولت مارکیٹ میں لائی ہے، بازار میں دولت رکھنے کی جگہ نہیں ہے، اس لیے ایک بار پھر بازار میں آوازیں گرفت میں آگئیں، یہ رکھو۔ پرانی لاشیں باہر۔۔۔!! ان کو سجاو۔۔۔!! نیا اسٹاک ڈالو۔۔۔! دکانداروں کی آواز بلند ہوئی اور اب باہر ساری پرانی لاشیں سجا رہی تھیں۔۔۔ ایک بار پھر فضا میں آوازیں گونجی۔۔۔ دیکھو۔۔۔ یہ مردہ جسم۔ لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آگے بڑھے لیکن پھر سے آوازوں سے روک دیا گیا: آؤ، ادھر آؤ تازہ لاشیں!!! جو آج آرڈر کرنے کے لیے تیار ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا اس بازار کی طرف متوجہ ہوتی گئی اور نیلامی زور و شور سے ہوتی گئی۔ اس طرح اس افسانے کی کہانی ختم ہوتی ہے۔ حمزہ حسن کے ہاں یہ بات زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہے کہ وہاں موت کو زیادہ ترجیح کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

د۔ ڈرون حملے:

اس خطے نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کیا کچھ نہیں برداشت کیا۔ کبھی ریہوٹ کنٹرول بم دھماکے، کبھی خود کش بم دھماکے، کبھی ٹارگٹ کلنگ تو اغواء، باقی رہی سہی کسر ڈرون حملوں نے پوری کر دی۔ پاکستان میں امریکی ڈرون حملے بین الاقوامی سکیورٹی حلقوں میں کافی بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ کچھ بحثیں ان ہڑتالوں کی افادیت اور مناسبت پر مرکوز ہیں۔ دیگر تجزیوں میں ڈرون کے استعمال کو قدر غیر جانبدار نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے، جیسے کہ انسداد بغاوت کی کوششوں کو تبدیل کرنے میں ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا۔ تاہم، ان اور دیگر تجزیوں نے پاکستان میں ریاست اور معاشرے پر ڈرون کے استعمال کے زمینی نتائج کو دیکھنے سے غفلت برتی ہے۔

اس باب کا مقصد پاکستانی عوام اور ریاست کی فلاح و بہبود پر ڈرون کے کچھ سنگین نقصان دہ اثرات کو اجاگر کر کے اس خلا کو پر کرنا ہے۔ سب سے پہلے، یہ ڈرون سے بچنے کے لیے پاکستان بھر میں مشتبہ دہشت گردوں کے

منتشر ہونے کا جائزہ لے گا۔ بہت سے مشتبہ عسکریت پسند جو امریکی شکاری اور ریپر ہوائی جہازوں کے ذریعے شکار کیے جا رہے ہیں، فاٹا سے نقل مکانی کر کے پاکستان کے دیگر حصوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یہ نقل مکانی ان کی نئی میزبان آبادیوں کے لیے سنگین، اور اکثر مہلک نتائج کے ساتھ آئی ہے۔ اس کے بعد، یہ دیکھا جائے گا کہ ڈرون حملوں نے پاکستان میں رائے عامہ پر کس طرح بنیاد پرست اثرات مرتب کیے ہیں، جس کے مختلف محاذوں پر منفی نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ آخر میں، یہ پاکستان کے جمہوری سیٹ اپ پر ڈرون کے اثرات کو دیکھے گا، جو آمریت کی تاریخ سے آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ نتیجہ بحث کا خلاصہ کرے گا۔

پاکستان کے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں امریکی ڈرون حملے ۲۰۰۴ء میں شروع ہوئے۔ قبائلی علاقوں کو پاکستان میں ایک الگ سیاسی حیثیت حاصل ہے اور وہاں پر ملک کے معیاری قوانین لاگو نہیں ہوتے۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد یہ علاقے القاعدہ اور طالبان کے مختلف عسکریت پسندوں کے نئے ٹھکانے بن گئے۔ اس کے فوراً بعد امریکیوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ قبائلی علاقے دور دراز ہونے کی وجہ سے ان کے پاس ان افراد کا سراغ لگانے کا بہت کم موقع تھا۔ فعال پاکستانی تعاون کی عدم موجودگی میں۔ اس لیے ڈرون حملے اس مسئلے کا بہترین جواب فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اب تک تقریباً ۳۷۰ حملے کیے جا چکے ہیں جن میں سے صرف ۴ حملے فاٹا سے باہر کے علاقوں کو نشانہ بناتے ہیں۔

ڈرون سے بچنے کے لیے پاکستان بھر میں مشتبہ دہشت گردوں کو منتشر کرنا ان کی نئی میزبان آبادیوں کے لیے سنگین نتائج کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر مشتبہ دہشت گرد فاٹا چھوڑ کر ملک کے دیگر حصوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ کراچی، لاہور اور فاٹا کے ان حصوں میں منتقل ہو گئے ہیں جنہیں ڈرونز سے زیادہ نشانہ نہیں بنایا گیا ہے۔ تاہم، اس اقدام سے ان افراد کے بنیادی ایجنڈے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، جو ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا ہے جنہیں وہ کافر سمجھتے ہیں۔ فاٹا میں، انھوں نے افغانستان میں امریکی افواج کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے قبائلی ٹھکانوں کا استعمال کیا، لیکن ان کی نقل مکانی کے بعد، وہ اپنی مقدس جنگ جاری رکھنے کے لیے پاکستانی شہریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ پاکستانی شہری اور ملک کی سیکورٹی فورسز کے ارکان ان افراد کے لیے جائز ہدف ہیں کیونکہ ریاست امریکہ کی سرکاری اتحادی ہے۔ اگرچہ ان کا ہدف بدل گیا ہے لیکن ان کا مشن وہی ہے۔ ڈرون کے حامی افغانستان میں مغربی افواج پر حملوں کی تعداد کو کم کرنے میں اپنی کامیابی کو اجاگر کرتے رہے ہیں۔ تاہم، دہشت گردی کا نشانہ بننے والے تقریباً پچاس ہزار پاکستانی شہریوں کا اس طرح کے جائزوں میں شاذ و نادر ہی ذکر ملتا ہے، اور ان میں سے ایک بڑی تعداد دہشت گردوں کا نشانہ بنی ہے جو ڈرون سے بچنے کے

لیے فائٹ سے منتقل ہوئے ہیں۔ ڈرون حملوں نے ملک میں رائے عامہ پر شدید بنیاد پرستی کے اثرات مرتب کیے ہیں، گزشتہ چند سالوں میں دائیں جانب سنجیدہ تبدیلی کے ساتھ۔ کرکٹر سے سیاست دان بننے والے عمران خان نے ان حملوں کو امریکی حب الوطنی کی مثال کے طور پر استعمال کیا ہے، ان پر بڑے پیمانے پر نقصانات اور بے گناہ شہریوں کی موت کا الزام لگایا ہے۔ خان کا خیال ہے کہ امریکی بغیر پائلٹ کے فضائی گاڑیوں کا استعمال زیادہ موثر نہیں رہا، کیونکہ افغانستان اور پاکستان میں حالات اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں جب ۲۰۰۲ء میں ابتدائی طور پر حملے کیے گئے تھے۔

عمران خان کی ملک کے نوجوانوں میں زبردست اپیل ہے اور ان کی بیان بازی نے نوجوانوں کو مغرب کے خلاف کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو کمزور کرنے کی ایک بڑی بین الاقوامی سازش ہے اور ڈرون اس عظیم حکمت عملی کا صرف ایک حصہ ہیں۔ خان نے کامیابی سے خود کو پاکستان میں سیاسی حق کے ترجمان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ڈرون کا یہ بنیاد پرست اثر پاکستان کے جمہوری اداروں کی تعمیر میں مدد کرنے اور اس کے متعدد ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے ملک کے عوام کی مدد کرنے میں امریکہ کے کردار کا منصفانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے لیے نقصان دہ ہے۔ ان حملوں کی وجہ سے عوام کا جو نقصان ہوا وہ کبھی شمار نہیں ہوگا، کیونکہ طاقتوں کو اپنے ٹارگٹ سے غرض ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہے کہ اس میں عام لوگوں کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ ان حملوں کی وجہ سے ہونے والے جانی و سماجی نقصان کو خیر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں برے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ اگر ہم جمیل کا چوخیل کی بات کریں تو اس کا افسانوی مجموعہ ”نوحہ بے نام“ اس طرح کی کئی کہانیوں کو پیش کرتا ہے جہاں ڈرون حملوں، خود دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات اور ان کے اثرات کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ھ۔ ٹارگٹ کلنگ:

پاکستان میں شہری ہلاکتوں کے بارے میں کوئی سرکاری اعداد و شمار یا درست ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ عدم تحفظ اور جاری لڑائی آزاد مبصرین کو جنگی علاقوں میں شہری نقصانات کا جامع اندازہ لگانے سے روکتی ہے۔ عسکریت پسند گروپ غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی صحافیوں اور این جی اوز کے کارکنوں کو نشانہ بناتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ ان کے زیر کنٹرول علاقوں سے بہت کم آزاد، قابل اعتبار معلومات سامنے آتی ہیں۔ پاکستانی حکومت بھی زیادہ تر تنازعات سے متاثرہ علاقوں تک رسائی کو سختی سے روکتی ہے۔ غیر ملکیوں کے لیے عام طور پر فائٹ کا سفر ممنوع ہے اور سوات اور مالاکنڈ کے دیگر علاقوں میں جانے کے لیے حکومت سے اجازت درکار ہوتی ہے۔ ذیل میں شہری ہلاکتوں کے مختلف اندازے ہیں۔ زیادہ تر تنظیموں نے میڈیا رپورٹس اور اپنے فیلڈ مانیٹر کی رپورٹوں پر انحصار کیا

ہے۔ اگرچہ پاکستانی حکومت نے گمنام طور پر مرکز کو عسکریت پسندوں یا دہشت گردانہ حملوں میں ہلاک یا زخمی ہونے والے شہریوں کے تخمینے کی پیشکش کی ہے، لیکن وہ عوامی طور پر مجموعی شہری ہلاکتوں کے اعداد و شمار جاری نہیں کرتی ہے اور نہ ہی اس بات کا کوئی اشارہ ملتا ہے کہ حکومت یا فوج سبھی کا جامع یا منظم حساب کتاب کر رہی ہے۔ شہری ہلاکتیں۔ تاہم، کے پی کے میں ڈسٹرکٹ کو آرڈینیشن افسران (DCOs) معاوضے کے مقاصد کے لیے اپنے اضلاع میں شہری ہلاکتوں کی معلومات جمع کرنے کی نگرانی کرتے ہیں۔ کے پی کے میں ڈی سی اوز اور دیگر مقامی حکام کے ساتھ انٹرویوز نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ ایک عام عمل ہے اور متعدد دفاتر نے تخمینی اعداد و شمار (سوات، بونیر اور لوئر دیر کے لیے اوپر دکھایا گیا ہے) شیئر کرنے پر اتفاق کیا۔ فاٹا میں ایسے انتظامی اداروں کے بغیر، یہ واضح نہیں ہے کہ وہاں شہری ہلاکتوں کی معلومات کتنی اچھی طرح سے جمع کی جاتی ہیں، حالانکہ فاٹا سیکرٹریٹ نے شہریوں کی ہلاکتوں کے معاوضے کے بارے میں معلومات شیئر کی ہیں (۲۰۰۸ء سے فاٹا میں ۱،۳۶۰ افراد ہلاک ہوئے)۔ ایک ساتھ دیکھا جائے تو یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ پاکستان میں شہری ہلاکتوں کا پیمانہ نمایاں ہے۔ اس کے مقابلے میں، ۲۰۰۹ء میں افغانستان میں ہر قسم کے تنازعات سے متعلق تشدد سے شہری ہلاکتیں ۲،۴۰۰ سے زیادہ تھیں۔^(۸)

اس طرح امکان ہے کہ ۲۰۰۹ء میں پاکستان میں عام شہریوں کی ہلاکتیں افغانستان سے بھی زیادہ تھیں۔ امریکی ڈرون حملوں کی وجہ سے عام شہریوں کی ہلاکتوں کی تصدیق کرنا خاصا مشکل ہے۔ اس طرح کے زیادہ تر حملے شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ہوتے ہیں، وہ علاقے جہاں غیر ملکیوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر پاکستانیوں کی رسائی نہیں ہے۔ زیادہ تر اندازے میڈیا رپورٹس پر مبنی ہیں، جو بدلے میں حکومتی اور فوجی حکام سے لے کر عسکریت پسند کمانڈروں اور مقامی سٹرنگرز تک کے ذرائع پر انحصار کرتے ہیں۔ زمین پر کوئی قابل ذکر موجودگی کے بغیر، امریکہ اپنے ڈرون آپریشن کے نتیجے میں ہونے والی شہری ہلاکتوں کی معلومات کے لیے الیکٹرانک اور فضائی نگرانی، مخبروں اور پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں پر انحصار کرتا ہے۔

”میں یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ یہ گھر ہے میرا۔ میں اسے کیسے چھوڑوں؟ میں نے زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے، چاہے وہ غیر ملکی ہے لیکن پھر بھی میرا خاوند ہی ہے۔ میں اپنے بچے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ وہ میرے بیٹے ہیں اور میں ان کی ماں۔ سب کچھ چھوڑ دینا کیسے ممکن ہے؟ رشتہ داروں نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سرحد پار پھٹنے والے بم اب اس کے گھر میں گر رہے ہوں۔ وہ شرمندہ ہی تھی کہ اس کا خاوند ایسے گھناؤنے کاموں میں ملوث ہے۔“^(۹)

۲۰۰۹ء کے بعد سے ۱۲۰ سے زیادہ حملوں میں ایک اندازے کے مطابق ۸۰۴-۱۱۳۶ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ امریکی حکومت کا دعویٰ ہے کہ شہری ہلاکتوں کی تعداد ۲۰ کے لگ بھگ ہے، جو کہ دوسرے آزاد تخمینوں سے بہت کم ہے۔ جون ۲۰۰۹ء میں اکیلے ایک حملے میں ۴۵-۶۰ افراد ہلاک ہوئے، جن میں ۱۸ عام شہری بھی شامل تھے۔ مرکز نے ڈرون متاثرین اور متاثرہ علاقوں سے دیگر افراد کے انٹرویو کیے اور اس بات کی تصدیق کی کہ ڈرون نے ایسے شہریوں کو نشانہ بنایا جن کا عسکریت پسندی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔^{۱۷}، مرکز نے بے نقاب کیا صرف نو واقعات میں ۳۰ سے زائد مبینہ شہری ہلاکتوں کی تحقیقات کی گئیں، جن میں سے سبھی جنوری ۲۰۰۹ء سے رونما ہوئے۔ مثال کے طور پر، کیا عسکریت پسندوں کو مدد فراہم کرنے والے خاندان کے افراد قابل قبول اہداف ہیں؟ سیاسی مدد فراہم کرنے والے قبائلی بزرگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ چونکہ حملوں کی تعداد کے مقابلہ میں بہت ہی کم قیمت والے اہداف مارے جاتے ہیں، اس لیے بلاشبہ ایسا ہے کہ مارے جانے والے جنگجوؤں کی اکثریت کو نچلے درجے کے عسکریت پسند سمجھا جاتا ہے۔ ڈرون حملوں میں شہریوں کی ہلاکتوں کے بارے میں پوچھے جانے پر ایک اعلیٰ سطحی پاکستانی اہلکار نے جواب دیا، "ریاست کے دشمنوں کو پناہ یا تحفظ نہ دیں۔۔۔ اگر ان کے پاس القاعدہ کا ایجنٹ ہے۔ القاعدہ یا ان کے گھر میں کوئی بھی، پھر یہی وہ قیمت ہے جو وہ ادا کرتے ہیں۔"

متعدد انٹرویو لینے والوں نے پاکستانی فوجی جیٹ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کی شہری علاقوں میں بمباری یا فائرنگ کرنے اور عام شہریوں اور جنگجوؤں کے درمیان صحیح طور پر فرق نہ کرنے کی وضاحت کی۔ غلام نور باجوڑ ایجنسی میں اپنے گاؤں کے بازار میں پیدل جا رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر گن شپ نے فائرنگ کی۔ "وہ بازار میں گولہ باری کر رہے تھے... یہ اندھا دھند گولہ باری تھی، لوگوں اور عسکریت پسندوں کے درمیان تفریق نہیں تھی... چھینٹنے نے میری ٹانگ اور سر پر وار کیا۔" حال ہی میں چار ماہ کے بیٹے کے ساتھ شادی شدہ غلام نور اب سینے سے نیچے تک مفلوج ہے۔ اس کے سر میں اب بھی چھلکا بند ہے جسے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسے ہٹایا نہیں جاسکتا۔

"فرض کرو۔۔۔ کبھی چوہدری کے گرمے تمہیں قتل کر کے نقشِ نیر میں بہادیں تو کیا پھر بھی تم اس دنیا میں موجود رہو گے؟ وہ دل کھول کر ہنستا اور جواب دیتا۔۔۔ ایسی کسی خبر کی تلاش میں تو ہوں میں۔" (۱۰)

ناقص انٹیلی جنس کی بنیاد پر فضائی حملوں میں عام شہریوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ ۱۰ اپریل، ۲۰۱۰ء کو، پاکستانی جیٹ لڑاکا طیاروں نے خیبر ایجنسی کے ایک گاؤں سراویلہ میں اہداف پر بمباری کی، ان کا خیال تھا کہ وہ ایک اعلیٰ سطحی عسکریت پسند کمانڈر کی میٹنگ کو نشانہ بنارہے تھے۔ تین بھائی سرکاری افواج کے ساتھ خدمات انجام دے

رہے ہیں۔ دوسرے بم نے پڑوسیوں کے ہجوم کو نشانہ بنایا جب وہ پہلے حملے میں زخمی ہونے والوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کم از کم ۶۰ شہری ہلاک اور ۳۰ زخمی ہوئے۔ محمد ایوب نے ان حملوں میں اپنے خاندان کے نو افراد۔ چار چچا، دو بھانجے اور تین کزن۔ کھودیے، یہ سب پہلے فضائی حملے کی زد میں آنے والے گھر کی طرف بھاگے تھے۔ "صبح کے ۱۰:۳۰ بجے تھے جب جیٹ فائٹرز نے ہمارے گاؤں کے ایک گھر پر بمباری کی۔ دھماکے کی آواز سننے کے بعد، قریبی دیہاتوں میں مولویوں نے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان کیا کہ کیا ہوا ہے اور قبائلیوں سے کہا کہ وہ زخمیوں کو بچانے اور ملے سے لاشیں نکالنے کے لیے جائے وقوع پر پہنچیں۔ لوگوں کی اکثریت جائے وقوع پر پہنچ گئی جہاں یہ واقعہ ہوا تھا۔ سیکڑوں لوگ اس موقع پر موجود تھے جب صبح ۱۱ بجے جیٹ فائٹرز دوبارہ آسمان پر نمودار ہوئے اور پہلے سے ہی تباہ شدہ مکان پر دوبارہ بمباری کی جس سے آس پاس کے تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ فضائی حملے سے افراتفری پھیل گئی اور لوگ ہر طرف بھاگنے لگے۔

و۔ جسمانی تشدد:

دہشت گردی کی تعریفیں عام طور پر پیچیدہ اور متنازعہ ہوتی ہیں، اور، دہشت گردی کی موروثی درندگی اور تشدد کی وجہ سے، اس اصطلاح کے مقبول استعمال میں ایک شدید بدنامی پیدا ہوئی ہے۔ یہ سب سے پہلے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں انقلاب فرانس کے دوران انقلابیوں کی طرف سے اپنے مخالفین کے خلاف استعمال ہونے والی دہشت گردی کا حوالہ دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ میکسمیلیئن روبسپیر کی جیکوبن پارٹی نے دہشت گردی کا راج چلایا جس میں گیلوٹین کے ذریعہ بڑے پیمانے پر پھانسی دی گئی۔ اگرچہ اس استعمال میں دہشت گردی کا مطلب ریاست کی طرف سے اپنے گھریلو دشمنوں کے خلاف تشدد کی کارروائی ہے، لیکن ۲۰ ویں صدی سے یہ اصطلاح اکثر تشدد پر لاگو ہوتی رہی ہے، جس کا مقصد براہ راست یا بالواسطہ طور پر حکومتوں پر پالیسی پر اثر انداز ہونے یا کسی موجودہ کو گرانے کی کوشش میں ہے۔

دہشت گردی کی قانونی طور پر تمام دائرہ اختیار میں تعریف نہیں کی گئی ہے۔ جو قوانین موجود ہیں، تاہم، عام طور پر کچھ مشترکہ عناصر کا اشتراک کرتے ہیں۔ دہشت گردی میں تشدد کا استعمال یا خطرہ شامل ہے اور یہ خوف پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، نہ صرف براہ راست متاثرین کے اندر بلکہ ایک وسیع سامعین کے درمیان۔ جس حد تک یہ خوف پر انحصار کرتا ہے وہ دہشت گردی کو روایتی اور گوریلا جنگ دونوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اگرچہ روایتی فوجی قوتیں ہمیشہ دشمن کے خلاف نفسیاتی جنگ میں مصروف رہتی ہیں، لیکن ان کی فتح کا بنیادی ذریعہ ہتھیاروں کی طاقت ہے۔ اسی طرح، گوریلا افواج، جو اکثر دہشت گردی کی کارروائیوں اور پروپیگنڈے کی دیگر اقسام پر انحصار کرتی ہیں، کا مقصد فوجی فتح اور کبھی کبھار کامیابی حاصل کرنا ہے (مثلاً، ویتنام میں ویت کانگ اور کمبوڈیا میں خمیر

روح)۔ اس طرح دہشت گردی کا صحیح استعمال خوف پیدا کرنے اور اس طرح سیاسی اہداف کے حصول کے لیے تشدد کا استعمال ہے، جب براہ راست فوجی فتح ممکن نہ ہو۔ اس کی وجہ سے کچھ سماجی سائنس دانوں نے گوریلا جنگ کو "کمزوروں کا ہتھیار" اور دہشت گردی کو "کمزوروں کا ہتھیار" قرار دیا ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۳۶
- ۲۔ ایضاً، ص ۳۸
- ۳۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، ص ۷۸
- ۴۔ یوسف عزیز زاہد، روشندان میں اندھیرا، ص ۹۴
- ۵۔ محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، ص ۱۲۲
- ۶۔ یوسف عزیز زاہد، روشندان میں اندھیرا، ص ۴۴
- ۷۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۷۷
- ۸۔ [chrome-extension://efaidnbmnnnibpcajpcglclefindmkaj/https://civiliansinconflict](https://civiliansinconflict.com/extension/efaidnbmnnnibpcajpcglclefindmkaj/)
- ۹۔ حمزہ حسن شیخ، قیدی، ص ۵۱
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۸۵

باب چہارم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

نائن الیون حملوں کے بعد افغانستان میں تنازعات اور عدم استحکام اور ان کے علاقائی مضمرات نے انتہائی منفی اثرات مرتب کیے، افغانستان پر امریکی حملے کے بعد کے برسوں تک نہ صرف سرحد پار سے پاکستان میں افغان مہاجرین کی بڑی تعداد میں آمد دیکھنے میں آئی بلکہ اس کے اثرات بھی دیکھنے میں آئے۔ پاکستان میں دہشت گرد حملوں کی تعداد اور پیمانے میں اچانک اضافہ ہوا ہے۔ ان پیش رفتوں کے مجموعی اثرات نے معیشت کے تمام بڑے شعبوں میں مجموعی شرح نمو کو بری طرح متاثر کیا۔ اس صورت حال کی وجہ سے پاکستان کو اقتصادی اور سیکورٹی دونوں لحاظ سے بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے اور قیمتی قومی وسائل کا ایک بڑا حصہ انسانی اور مادی دونوں طرح سے، پچھلے کئی سالوں سے ابھرتے ہوئے سیکورٹی چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے موڑ دیا گیا ہے۔ افغانستان میں عدم استحکام کی وجہ سے پاکستان میں پر تشدد انتہا پسندی اور دہشت گردی میں اضافے نے نہ صرف پاکستان کی معیشت کو شدید نقصان پہنچایا بلکہ شہری آبادی کے خلاف اندھا دھند حملوں کی وجہ سے بڑے پیمانے پر انسانی تکالیف کا بھی ذمہ دار ہے۔

اس صورتحال نے پاکستان کی معمول کی اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں میں خلل ڈالا جس کے نتیجے میں نہ صرف کاروبار کی لاگت زیادہ ہوئی بلکہ پیداواری چکروں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوئیں، جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں برآمدی آرڈرز کو پورا کرنے میں نمایاں تاخیر ہوئی۔ نتیجتاً پاکستانی مصنوعات نے بتدریج اپنے حریفوں کے سامنے اپنا مارکیٹ شیئر کھو دیا ہے۔ نتیجتاً اقتصادی ترقی منصوبہ بندی کے مطابق نہ بڑھ سکی۔ پاکستان میں سرمایہ کاری کے اخراج اور سرمائے کی آؤٹ سورسنگ کے منفی رجحانات نے برآمدات پر مبنی صنعت کی گرتی ہوئی کارکردگی کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نائن الیون نے دنیا کو بدل دیا ہے۔ نتیجتاً اس نے ادب کو بھی بدل دیا ہے۔ نائن الیون کے اثرات اور مسلم مصنفین خصوصاً پاکستانی مصنفین کی طرف سے اس کی ادبی نمائندگی ایک طرف تو مسلمان امریکیوں کے ساتھ پسماندہ اور غیر انسانی سلوک کی بصیرت فراہم کرتی ہے اور دوسری طرف امریکیوں کی امتیازی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے۔ امریکی اور برطانوی مصنفین نے بھی اپنے لٹریچر میں نائن الیون کی نمائندگی کی ہے لیکن

یہ نمائندگی اسلام کو شیطانی، اور مسلمانوں کے عقیدے اور اس کے بنیادی اصولوں کی تذلیل اور بدنامی کرتی ہے۔ نائن الیون کے دہشت گردانہ حملوں کے ایک سال بعد ۲۰ سالہ زائد کتابیں لکھی اور شائع کی گئیں جن کا مرکزی موضوع خطرہ، دہشت گردی اور تباہی کو اسلام سے جوڑنا تھا۔ اس طرح کی ادبی پیداوار کے جواب میں، پاکستانی مصنفین نے اس منفی تصویر کو چیلنج کیا۔ نائن الیون کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد مسلمان دہشت گرد ہے اور یہ ناولوں میں ظاہر ہے۔ ان افسانوں اور ناولوں نے انتہا پسندی، دشمنی، خوف، مزاحمت، دہشت، شناخت جیسے اہم مسائل کو اجاگر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ایک روشن خیال اور آزاد معاشرے کو پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ محمد جمیل کاچوخیل، یوسف عزیز زاہد اور حمزہ حسن شیخ جیسے مصنفین نے کامیابی سے جمود کو توڑا، سوال کیا اور چیلنج کیا۔ انھوں نے اپنے مرکزی کرداروں کے ذریعے ایسی کہانی پیش کی جس نے خیر پختونخوا کو شناخت کے بحران کے اتھاہ گہرائیوں سے نکالا ہے جس میں نائن الیون نے انہیں ڈبو دیا تھا اور ان کے لیے متحد شناختیں بنادی تھیں۔ یہ مصنفین نوآبادیات سے آگے بڑھتے ہوئے خطے کو غیر آباد کرنے کی طرف خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایسا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں امریکہ اور تمام مغربی یورپی اقوام کو مکالمے کی میز پر مدعو کریں جہاں مشرق اور مغرب کے نمائندے جنگ کو ہار اور جیت کی بجائے انسانی ایسے کو طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان افسانوں نے جنگ زدہ علاقوں کی وہ کہانیاں سامنے لائی ہیں جو بم دھماکوں کی مٹی تلے دب چکی تھیں۔

ان افسانوں کی مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے جنگ صرف دشمن کی شکست کا نام نہیں بلکہ اپنے لوگوں کی تباہی اور سماجی انہدام کا نام ہے۔ ان افسانوں میں سب سے زیادہ جنگ کی تباہی کو پیش کرنے میں حمزہ حسن نے اپنا قلم استعمال کیا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ”قیدی“ اس بات کی گواہی ہے کہ انھوں نے جنگ زدہ خیر پختونخوا کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں خودکشی، نوٹ بک، باغی، قیدی، کٹے پھٹے دھڑکا مکالمہ، روٹی، انار گلے، رحیمو کی ریڑھی، آزادی، چاکلیٹ، بیری کا درخت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حمزہ حسن شیخ اردو ادب کے نوجوان ادیب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ حمزہ حسن بیک وقت شاعر، کہانی کار اور مترجم ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی سرگرمی کا آغاز بچوں کے لیے کہانیاں لکھ کر کیا۔ بہت کم عرصے میں آپ نے بچوں کی کہانیوں کے تین مجموعے، دو انگریزی ناول، انگریزی شاعری کے تین مجموعے اور کہانیوں کے دو مجموعے لکھے۔ ”کاغذ“ ان کا اردو کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۴ء میں راولپنڈی سے شائع ہوا تھا۔ ”کاغذ“ ان کا منفرد اور افسانوی مجموعہ ہے، کیونکہ یہ افسانوی مجموعہ تمام تکنیکی چیزوں کا خیال رکھتا ہے۔ ڈیزائن، کردار نگاری، مضمون نگاری، عکاسی اور انداز۔ مختصر یہ کہ آپ نے ان تمام

مواد کی بہت احتیاط سے دیکھ بھال کی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بیرونی حقیقت پسندی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ”کاغذ“ فنی اور فکری پختگی کا بہترین نمونہ ہے۔ زندگی کے تمام مسائل اور ان کا حل ان کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ ”کاغذ“ میں ہمارے ارد گرد کی زندگی کے مسائل اور بے قاعدگیوں کی عبارتیں ہوتی ہیں۔ ان کی کہانی کا مرکزی موضوع محبت ہے۔ حمزہ حسن نے اپنی کہانی میں کم سے کم اور جامع انداز اپنایا ہے۔ حمزہ نے اپنی کہانی میں غریب طبقے کی مکمل نمائندگی کی ہے۔

جہاں تک ”کاغذ“ کا تعلق ہے تو ان کہانیوں کے مجموعے حمزہ حسن شیخ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ اخبار نے غریب اور محنت کش طبقے کی آواز کو دنیا کے کانوں تک پہنچایا ہے۔ ان کی کہانیوں سے واضح نظریاتی وابستگی ہے۔ وہ ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں۔ حمزہ نے زندگی کے مختلف سانحات کو کاغذ پر خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ وہ جس کلاس کی بات کرتے ہیں وہ ان کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہے۔ غربت، افلاس، لالچ، جہالت، معاشرے کی تلخ حقیقتیں، حادثات، مٹھی کے کھیل، کھیل اور علاقے کا نظارہ، تہذیب اور مقامی ثقافت، دیہات، کھیت، سماجی شعور، عدم تحفظ اور شناخت کا بحران ان کی کہانیوں کے اہم اجزاء ہیں۔ ہمارے ارد گرد کے لوگ اپنی کہانیوں میں کردار کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ان میں مزدور، چرواہے، کسان، استاد، بھکاری، کمہار، شیٹھ، حاجی صاحب، لڑکے لڑکیاں، بھکاری، بابو، میاں، مولوی، بچے اور عورتیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے کاغذ پر قدرتی مناظر کو بھی بہت خوبصورت انداز میں پینٹ کیا۔ اس میں بارش، سیلاب، دریائی پرندوں، سمندر، درختوں، کھیتوں، پھولوں وغیرہ کی بہت خوبصورت تصاویر فراہم کی گئی ہیں۔ ان کے بولنے کا انداز بہت سادہ اور رواں دواں ہے۔ کتاب ”کاغذ“ پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حمزہ حسن شیخ ایک اچھے کہانی کار ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ ایک نوجوان لکھاری ہیں لیکن پھر بھی ان کی کہانیاں اردو کے معیار کے مطابق ہیں۔ یہ کہانیاں تکنیکی اور فکری تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ آپ کردار کی پریزنٹیشن اور ڈائلاگ ڈیلیوری کے آداب سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے افسانوں میں کمزوریاں ہیں، ”کاغذ“ ان کا پہلا کہانی مجموعہ ہے، جو افسانے کی اس صنف کا آغاز ہے۔ اس لیے ان کا بیانیہ انداز بہت ہموار اور سادہ ہے جب کہ اکیسویں صدی کے افسانوں میں تجرید اور پیچیدگی کے ساتھ نفسیاتی آگہی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سب کے ساتھ ”کاغذ“ قارئین کے دلوں میں گھر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم یوسف عزیز زاہد کی بات کریں تو ان کو افسانوں میں بھی جنگ اور دہشت گردی سے تباہ حال معاشرہ نظر آتا ہے جہاں، موت ہے، بے گھری ہے، بے روزگاری ہے، خوف ہے اور دہشت ہے۔ اپنا ایک

الگ اور خاص اسلوب ہے جہاں جدت، گہرائی اور معنی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ تمام چھوٹے بڑے واقعات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیانیہ انداز ان کی وسعت، بصیرت انگیز مشاہدہ اور تحریر کو ظاہر کرتا ہے۔ یوسف عزیز زہد کی کہانیاں تلخ حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ اس لیے علامت اور حقیقت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔ "روشن دان میں اندھیرا" یوسف عزیز زہد کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جہاں مصنف کو قارئین کی سمجھ کے لیے "لا یعنیت کی بھیڑ میں" ایک مختلف انداز میں دیکھا گیا ہے۔ دونوں کہانیوں میں تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا صحیح استعمال کیا گیا ہے۔ محاورے کا استعمال تقریر میں اثر بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیتیں بھی منفرد اور معاشرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کے انسانوں میں مرد اور عورت کے کردار الگ الگ ظاہر ہوتے ہیں۔ یوسف عزیز زہد کی کہانیوں میں مردوں اور عورتوں کے حقیقی چہرے دکھانے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ ان میں بے جان کردار بھی ہیں۔ جب انسان کو معاشرے میں بد امنی، نا انصافی، بے یقینی اور عدم تحفظ جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو روشن دان بھی تشویش کا باعث بنتا ہے۔ ہم روشن دان میں روشنی کے منتظر ہیں۔ معاشرہ اپنے اصولوں کی وجہ سے روشنی اور شعور کا نمائندہ بنتا ہے۔ پاکستان کا سیاسی اور معاشی توازن مختلف مسائل سے دوچار ہے جس نے باخبر اور حساس لوگوں کو دوچار کر رکھا ہے۔

ملک کے سیاسی حالات اور دہشت گردی کی فضا اس قدر خراب ہے کہ لکھنے والوں نے علامتی کہانیاں بنا کر اپنی آواز بلند کی ہے۔ یوسف عزیز زہد معاشرے کو اعلیٰ اقدار تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد کی تبدیلیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور افسانوں کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ دور پاکستان اور دنیا میں سیاسی، سماجی، معاشی اور غیر یقینی کشمکش کے عروج کا دور ہے۔ ان افسانوں میں سیاست اور معاشرے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اعلیٰ اور نچلے طبقے کے رویے، آداب، لباس، عادات، آداب، بول چال، سماجی میل جول اور خوشی و غم میں بہت فرق ہے۔ نیز سیاسی اور سماجی سطح پر ظلم کی مختلف شکلوں کا پول نہیں کھلتا۔ دوسری طرف محبت، نفرت، غصہ کی تشریح بھی ہے۔ انسان کو سیاسی استحصال کا سامنا ہے اور اگر وہ اس بے بسی کو قبول کر لیتا ہے تو دوسری طرف اس سے بغاوت کرتا نظر آتا ہے۔ ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اسے قبول نہ کرنے کا حوصلہ نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یوسف عزیز زہد کی کہانی سماجی شکست و ریخت اور دہشت گردی پر سیاست کی ناکامی پر ایک بھرپور طنز کے طور پر کام کرتی ہے اور اس لیے اردو کی مشہور کہانی میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کے بعد اگر ہم محمد جمیل کا چوخیل کی بات کریں تو ان کے ہاں بھی ہمیں خوف، دہشت، بم دھماکے، دہشت گردی کا ڈر، موت، تنہائی سماجی شکست و ریخت اور فرد کی نفسیاتی کمزوری جیسے عناصر جا بجا ملتے ہیں۔ محمد جمیل

کاچو خیل کے ہاں یہ واقعات سے زیادہ جذبات کے تناظر میں ملتے ہیں۔ انھوں نے جنگ کو بطور انسانی المیہ کے پیش کیا ہے جہاں انسان کی انفرادی و سماجی زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ محمد جمیل کاچو خیل کے ہاں اس جذباتی و نفسیاتی انہدام کے پیچھے وہی دہشت گردی ہے جو یوسف عزیز اور حمزہ حسن کے افسانوں کے پس منظر میں کار فرما ہے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے دہشت اور جنگ کو اپنے افسانوں میں بھرپور انداز میں پیش کیا اور اپنے معاشرے کی تباہی پر کھل کر بات کی ہے جس کی وجہ سے اس خطے کے ادب میں نئے موضوعات کا اضافہ ہوا ہے اور ادب کو اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا موقع ملا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

تحقیق سوالات کی روشنی میں یہ تحقیق مکمل ہو کر مندرجہ ذیل نتائج پیش کرتی ہے۔

۱۔ خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے دہشت اور جنگ کے اثرات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ انہیں اپنے افسانوں میں بھرپور انداز میں برتا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہشت گردی نے اس خطے کے ادب میں نئے زاویہ نگاہ پیدا کیے ہیں۔

۲۔ خیبر پختونخوا کے معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں دہشت گردی کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف اور دہشت کی پیش میں علامتی انداز کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے بلکہ واقعات اور مسائل کو صریحاً پیش کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے ادب کو عوام میں پذیرائی ملی ہے۔

۳۔ خیبر پختونخوا کے معاصر افسانہ نگاروں کی ہاں خوف اور دہشت کی انفرادی و اجتماعی سطح پر وجوہات اور اثرات کو بڑے واضح اور گہرے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جن کی وجوہات کی ذیل میں دہشت گردی، خود کش دھماکے، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان وغیرہ ان کے اثرات میں انفرادی و اجتماعی سطح پر خوف، ڈر، دہشت، تنہائی، بے گھری، بے روزگاری، ہجرت جیسے مسائل سامنے آتے ہیں۔

ج۔ سفارشات:

تحقیق کی روشنی میں مندرجہ ذیل سفارشات پیش خدمت ہیں:

۱۔ خیبر پختونخوا دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثرہ خطہ ہے۔ جس کے ادب میں بھی وسیع پیمانے پر تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس خطے کے ادب کا دہشت گردی کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔

۲۔ اس خطے کے ادب نے نئی نفسیاتی گریز نہیں کھولی ہیں، جن میں خوف اور دہشت اور تنہائی سرفہرست ہیں۔ ان تینوں انفرادی و سماجی مسائل پر مزید کام کرنے کی گنجائش ہے۔

۳۔ اس خطے کے لوگوں نے معاشی حوالے سے بے پناہ نقصان اٹھایا ہے۔ ادب چونکہ سماجی سطح پر معاشی تبدیلیوں کو بھی پیش کرتا ہے اس لیے دہشت گردی کی وجہ سے معاشی سطح پر اس خطے میں کن مسائل نے جنم لیا ہے ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ اگر ہم دہشت گردی کو عالمی سطح کے کلامیہ کے حیثیت سے دیکھیں تو پھر یہ خطہ مختلف ممالک کی پر اسی جنگوں کا میدان بھی رہا ہے۔ اس خطے کے اردو افسانہ نگاروں نے ان مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس تناظر میں بھی کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۵۔ خیبر پختونخوا کے سماجی پیٹرن کو دوبارہ نارمل کرنے کے لیے ہمیں وسیع پیمانے پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ جن میں سرفہرست یہاں کے ادب کا مطالعہ ہے۔ اس تناظر میں ملکی سطح پر ایک پالیسی بنانے کی ضرورت ہے جس میں ادب ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

- حمزہ حسن شیخ، کاغذ، الفتح پبلشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء
حمزہ حسن شیخ، قیدی، فلشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۲۱ء
محمد جمیل کاچوخیل، جلتا سر اسلگتی روح، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء
محمد جمیل کاچوخیل، میرا برزخ، مثال پبلشرز امین پور بازار، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء
محمد جمیل کاچوخیل، نوحہ بے نام، بلال پریس، بٹ خیلہ، ملاکنڈ ایجنسی، ۲۰۱۱ء
یوسف عزیز زاهد، لایعنیت کی بھیڑ میں، ملاقات پبلی کیشنز، پشاور، ۱۹۹۶ء
یوسف عزیز زاهد، روشندان میں اندھیرا، ملاقات پبلی کیشنز، پشاور، ۲۰۱۳ء
سگمنڈ فراڈ، تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، مترجم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

ثانوی مآخذ:

- اعجاز رائی، ڈاکٹر، اردو افسانے میں علامت نگاری، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
ثروت اختر، ڈاکٹر، اردو ادب میں دہشت گردی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۲۱ء
سمیل احمد، پاکستانی زبان و ادب پر ۹/۱۱ کے اثرات، مرتبہ، ادارہ ادبیات اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۱۲ء
سیموئیل پی، سننگٹن، تہذیبوں کا تصادم، محمد احسن بٹ، مترجم، مثال پبلشنگ لاہور، ۲۰۰۳ء
گوہر نوید، پروفیسر، خیبر پختونخوا میں اردو ادب، یونیورسٹی پبلشرز، پشاور، ۲۰۲۰ء
مصطفیٰ اکیول، اسلام شدت پسندی کے بغیر، مقبول الہی، پروفیسر، مترجم، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء
ناؤم چو مسکی، دنیا کی بے اطمینانی، فرنٹ لائن، دہلی، انڈیا، ۲۰۰۱ء
نجیبہ عارف (مرتبہ) ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، بار اول، مئی ۲۰۱۱ء

انٹرنیٹ / ویب سائٹس:

www.wikipedia.org/wiki/D8

www.Facebook.com

مقالہ جات:

تیمور اختر، ادبیات کے شخصیات نمبرز کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، مملو کہ وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

محمد بشارت، اردو نظم پر دہشت گردی کے اثرات، مقالہ برائے ایم فل اردو، مملو کہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

سید زبیر شاہ، اردو افسانے پر نائن الیون کے اثرات، مقالہ برائے ایم فل، مملو کہ قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۱۲ء
محمد عمران مائل، اکیسویں صدی کا سیاسی منظر نامہ اور اردو افسانہ، مقالہ برائے ایم فل، مملو کہ قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، ۲۰۱۷ء
نازیہ ملک، ڈاکٹر، پاکستانی اردو افسانے میں عصری آگہی، تجزیاتی مطالعہ آغاز تا ۲۰۱۰ء، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، مملو کہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

انگریزی کتب:

Freud, Sigmund. A General Introduction to Psychoanalysis by Sigmund Freud. Beyond Books Hub, 2021.

Freud, Sigmund. Inhibitions, symptoms and anxiety. WW Norton & Company, 1977.

Pyszczynski, Tom, Sheldon Solomon, and Jeff Greenberg. In the wake of 9/11: The psychology of terror. American Psychological Association, 2003.